صندل کا جنگل

فرحت پروین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

صندل کا جنگل

فرحت پروین

جہانگیر بکس

• لاہور • راولپنڈی • ملتان • فیصل آباد • حیدرآباد • کراچی

قانونی مشیر: چوہدری ریاض اختر (ایم اے ایل ایل بی)

ناشر: فواز نیاز
قیمت: -/275 روپے
اشاعت: 2010ء
آفس: 257 ریواز گارڈن، لاہور۔ فون: 042-7213318 فیکس: 042-7213319
تقسیم کنندہ: سیلز ڈپو لاہور: اردو بازار۔ فون: 042-7220879
سیلز ڈپو کراچی: اردو بازار۔ فون: 021-2765086
سیلز ڈپو راولپنڈی: اقبال روڈ نزد کمیٹی چوک۔ فون: 051-5539609
سیلز ڈپو ملتان: اندرون بوہڑ گیٹ۔ فون: 061-4781781
سیلز ڈپو فیصل آباد: کوتوالی روڈ، نزد امین پور بازار۔ فون: 041-2627568
سیلز ڈپو حیدرآباد: مکان نمبر 194/8، نزد علی مینشن، رجپت روڈ۔ فون: 022-2780128

www.anarkamman.com
www.jbdpress.com

نیاز جہانگیر پرنٹرز، غزنی سٹریٹ اردو بازار، لاہور نے پرنٹ کی۔ فون: 042-7314319

انتساب

اپنے چمن کے باغبان انعام خان

اور

اُس میں مہکتے پھولوں

حُسنی، ریما، سومی اور یمل

کے نام

میں اور میری کہانیاں

ہر تخلیق کار کے اندر فطری طور پر ایک بے چینی، ایک اضطراب ہوتا ہے۔ جو دراصل تخلیق کا جوہر ہوتا ہے اور اپنا اظہار چاہتا ہے۔

یہ اضطراب جب رنگوں میں ظہور پذیر ہوتا ہے تو مصوری کے شاہکار منصۂ شہود پر آتے ہیں۔ سُروں میں ڈھلتا ہے تو موسیقی کے معجزے تخلیق کرتا ہے اور جب لفظوں میں سرایت کرتا ہے تو شاعری ساحری اور ادب پارے فن پارے قرار پاتے ہیں۔

میرا اضطراب کہانی کی شکل میں صورت پذیر ہوا۔ میں کہانیوں پر کہانیاں لکھتی چلی گئی۔ کہانی لکھنا میرے لئے سانس لینے جیسا خودکار عمل تھا۔

دُکھ میری ذات کی تنگنائے سے نکل کر کائنات کے بیکراں سمندر تک پھیلے اور پھیلتے چلے گئے۔ فطرت میری دوست بن گئی۔ ہوائیں، فضائیں اور موسم مجھ سے ہمکلام ہونے لگے۔ دل کی پہنائیوں میں ایک دُنیا کے درد آ سمائے۔ اب میں کہانیاں تلاش نہیں کرتی۔ کہانیاں خود میری راہ دیکھتی ہیں۔

کہانی میرے ذہن و دل میں اُتر کر یہ راز مجھ پر منکشف کر گئی کہ ہر شخص اپنے اندر کئی اَن کہی کہانیاں لئے پھرتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ ''دنیا میں صرف چند کہانیاں ہیں جو ازل سے دہرائی جارہی ہیں۔ مگر بدلتے

زمانے اور بدلتے حالات کے ساتھ ان کی صورت حیران کن حد تک تبدیل ہو گئی ہے پھر انسانی فطرت کی بوالعجبی، شعور و لاشعور کے عیار اور سفاک کھیل نت نئی کہانیوں کو جنم دیتے رہتے ہیں۔ سو میں کہانیاں لکھتی رہی، لکھتی رہی اور ایک روز مجھے خیال آیا کہ ذات و کائنات کے عیاں و نہاں رنگوں، نئی نئی جہات اور گوناگوں موضوعات کے تناظر میں تو یہ سلسلہ لامتناہی ہے۔ کوئی کہاں تک لکھے۔

میں نے کہانیاں لکھنا چھوڑ دیا اور چند ماہ کے عرصے میں یہ بھید مجھ پر کھل کر مجھے حیران کر گیا کہ میرا وجود تو کہانیوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ میں تو ڈھیروں ڈھیر کہانیوں کے گرد بنا ہوا ایک خول ہوں اور اگر مجھ میں سے ساری کہانیاں نکال لی جائیں تو میں پنیاٹا (پنی۔یا۔ٹا) کی طرح صرف ایک خشک کھڑکھڑاتا خول رہ جاؤں گی۔ سو لکھنا میری ضرورت ٹھہری۔ اور وہ اپنی اندرونی ضرورت لکھتا ہے۔ وہ ذہن و روح کی پوری توانائیوں کے ساتھ اُس میں موجود ہوتا ہے۔

سو میں لفظ لفظ، سطر سطر میں موجود ہوں۔

میں جانتی ہوں کہ میری کہانیاں کوئی انقلاب نہیں لاسکتیں۔ بگڑے ہوئے نظام کو نہیں سنوار سکتیں۔ مگر مجھے تو ظلمت سے جنگ میں اپنا کردار ادا کرنا ہے۔ اپنے حصے کی شمع جلانی ہے ممکن ہے اس کی کوئی کرن کسی تاریک گوشے کو اُجال دے۔ میرا سوز و گداز کسی کے دل میں احساس کی کوئی لہر بیدار کر دے۔ کسی کو سوچنے پر مائل کر دے۔

اب میں اور میری کہانیاں آپ کے سامنے ہیں۔ پسند ناپسند کا آپ کو اختیار ہے لیکن میں پھر بھی لکھتی ہی رہوں گی کہ یہ میری ضرورت بھی ہے اور مجبوری بھی۔

فرحت پروین

فہرست

صندل کا جنگل

''سنو! مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔''

''نہیں کچھ نہ بولو...... کوئی آہٹ پیدا نہ کرو...... بس چپ چاپ اپنی ساری نرمی اور مٹھاس کے ساتھ میرے پاس آ کر بیٹھ جاؤ۔''

تم نے کلی کی پتیاں کھلنے کی آواز سنی، خوشبو کو بل کھا کر اس میں سے نکلتے دیکھا۔ تم نے اس کا نرم رو سفر دیکھا۔ تم نے دیکھا وہ جدھر سے گزرتی ہے نوخیز کونپلیں کپکپانے لگتی ہیں اور شریر شاخیں ہنسی اپنے اندر دبانے کو دہری ہو ہو جاتی ہیں۔

سنو! سنو...... کسی انجانی سمت سے شبنم کے اترنے کی غیر محسوس آہٹ کو سنو، تم دیکھ رہی ہو ناں...... پھول، پتے، سبزہ، سب اس کی پذیرائی کو ذرا سا اٹھے ہیں۔ منتظر، چوکس، مشتاق، بالکل ویسے جیسے پرانے وقتوں میں کسی باہر سے آنے والے بادشاہ کا کئی منزل آگے بڑھ کر استقبال کیا جاتا تھا۔ یہ رسم قدیم یہاں اب بھی رائج ہے کہ یہاں مکروہات زمانہ کا گزر نہیں۔

ایک بات بتاؤں تمہیں، وہ سامنے پیڑ دیکھ رہی ہو نا، جس کی نازک نازک ٹہنیوں پر بکی بکی کنواری ہری کونپلوں کے بیچ گچھے دار سرخ پھول یاقوت کے آویزوں کی طرح جھلملا رہے ہیں۔ کیسی شادابی اور دمک ہے ان کے رنگ میں...... جیسے کسی جوہری نے اپنے شاہکار کی نمائش کی ہو۔ اس صبح میں اس طرف سے گزرا تو میری نگاہ اس پر اٹک گئی۔ شب گزشتہ کی بارش

کے ننھے ننھے قطرے شاخوں پر نگینوں کی طرح جگمگا رہے تھے۔ ایک چڑیا جس کی پشت شفق رنگ پروں سے ڈھکی ہوئی تھی اور سینہ دھنکی ہوئی روئی جیسے ملائم بادل سے بنا ہوا تھا۔ ایک شاخ پر آ کر بیٹھی۔ اس کے بیٹھنے سے شاخ ذرا سی لرزی اور اس پر اٹکی ہوئی بارش کی بوند ٹپکنے کو ہی تھی کہ چڑیا نے ایک ناقابل بیان پھرتی سے الٹا لٹک کر اپنی عنابی چونچ سے اس بوند کو پی لیا۔ وہ الوہی لمحہ، وہ فردوسی منظر میں نے پورا کا پورا اپنے اندر اتار لیا۔ اس کی تصویر پوری جزئیات کے ساتھ میرے اندر نقش ہے۔ مگر نجانے کیوں مجھے ایسا لگا وہ چڑیا تم ہو۔ حسن کی ایسی تعظیم، ایسی تکریم تمہارے سوا اور کون کرے گا۔

تم میری بات پر ہنس رہی ہو...... تو سنو!

کل رات میں جھیل کے کنارے بیٹھا تھا۔ لہریں چاند کے عکس سے کھیل رہی تھیں اور مجھے لگا یہ تمہاری بے ساختہ ہنسی ہے جو روشنی بن کر ادھر ادھر پھیل جاتی ہے۔ تم مجھے دیوانہ سمجھ رہی ہو نا...... مگر مجھے تو جھرنے کے ایک مترنم جھنکار کے ساتھ بہتے پانی کو دیکھ کر اس کی جھنکار سن کر یہی لگا تھا کہ یہ تم محو کلام ہو۔

میں نے تمہیں فطرت کے ہر رنگ ہر روپ میں دیکھا ہے۔ برستی بارش کی شوخی میں دیکھا ہے، چمکتی بجلی کی شرارت میں دیکھا ہے۔ پھولوں کے جوبن میں دیکھا ہے، صبا کی تازگی میں دیکھا ہے، صبح کی پہلی کرنوں میں دیکھا ہے، شفق کی لالی میں دیکھا ہے۔ چاندنی کے اجلے پن میں دیکھا ہے تو رات کی پراسرار تاریکی میں بھی دیکھا ہے۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ تمہیں پھیلا کر پوری کائنات بنا دی گئی ہے...... یا پھر پوری کائنات کو سمیٹ کر تمہیں بنا دیا گیا ہے۔

جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تھا تو پتہ نہیں کیوں ایسا لگا تھا جیسے تم ابھی ابھی کسی اور سیارے سے اتری ہو اور اس دنیا کو پہلی بار دیکھ رہی ہو۔ ایسا ہی نیا نیا کورا پن تمہارے چہرے پر...... ایک معصوم حیرت اور سرخوشی سے چھلکتی آنکھوں میں متجسس اشتیاق تھا۔ تمہارے لہجے میں تمہاری ہنسی میں عجب بے ساختہ پن تھا۔

دنوں تک یہ حیرت میرے ذہن سے چمٹی رہی۔ کیا بھید ہے کہ وقت اور زمانہ تمہیں چھو نہیں سکا۔ کیا تم کسی برج میں پلنے والی قصر نشین شہزادی تھیں، جس کے پاس مسائل کا تصور ہی نہ تھا۔ یا پھر سیم و زر میں کھیلنے والی اپنی نمائشی دنیا میں مگن بے حس و بے پروا لڑکی، مگر تم ایسی کہاں

تھیں، تمہاری آنکھوں میں نرمی اور چہرے پر اپنائیت بھری مسکراہٹ تھی آواز دلنشیں اور لہجہ شہد بھرا تھا۔

تمہیں جاننے، اس بھید کو پانے کی مجھے جستجو سی لگ گئی۔ میں اس انوکھی خواہش پر خود حیران تھا مجھے اپنا آپ اجنبی لگنے لگا۔

اور پھر ایک معجزہ ہو گیا۔

اس روز میں ارشد سے ملنے اس کے گھر گیا تو دروازہ تم نے کھولا۔ میں فرطِ حیرت اور خوشی سے ساکت کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔

''تشریف لائیے'' تم نے راستہ دیتے ہوئے کہا۔

اور میں خواب کی سی کیفیت میں چلتا ہوا تمہارے پیچھے پیچھے چلا آیا۔

تم نے بتایا کہ ''اچانک نیلم خالہ کے پیر میں چوٹ آ گئی ہے۔ ڈر تھا کہ ہڈی نہ چٹخ گئی ہو یا جوڑ نہ ہل گیا ہو تو وہ ایکسرے کرانے ہسپتال گئے ہیں...... بس آتے ہی ہوں گے۔''

تم نے چائے کا پوچھا تو میں نے منع کر دیا کہ ان کے آنے پر ساتھ ہی پئیں گے اور پھر موقع غنیمت جان کر میں نے گفتگو کا آغاز کر دیا۔ مجھے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ تم کترا رہی ہو اور جانا چاہتی ہو مگر میں نے خود غرض بن کر تمہیں باتوں میں الجھائے رکھا۔ تم مروتاً اور تکلفاً رک گئی مگر پھر آہستہ آہستہ سہولت پذیر ہو گئیں۔ بات نیلم بھابی کی چوٹ کی تفصیل سے موسم اور پھر حالاتِ حاضرہ پر آ گئی۔

''اب تو دنیا میں صرف جرم، نفرت اور برائی ہی رہ گئی ہے۔ اچھائی تو تقریباً......''

اور تم نے بے صبری سے میری بات کاٹ کر کہا۔ ''نہیں، ایسا نہیں ہے۔''

''ایسا ہی ہے...... ہر دسواں آدمی کسی نہ کسی اعتبار سے مجرم ہے۔'' میں نے اپنی بات کی وضاحت کی۔

''فرض کریں میں آپ کی بات مان بھی لوں تو بھی اس کا مطلب ہے کہ دس میں سے نو آدمی اچھے ہیں اور ایک برا...... پھر بھی اچھائی ہی زیادہ ہوئی نا......''

میرے پاس کہنے کو بہت کچھ تھا مگر میں نے خود کو روک لیا۔ میں سچائی اور اچھائی پر تمہارے اتنے پختہ یقین کو دلیل و منطق سے متزلزل نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے صرف اتنا کہا۔

''ہاں، آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔''

تمہارا دل بڑھ گیا...... تم کہہ رہی تھیں:

''اللہ تعالیٰ نے تو ہر دل میں اپنی ازلی ہدایت کے نور کی شمع روشن کر رکھی ہے۔ مگر ہم جوں جوں دنیا کے مکر و فریب میں الجھتے جاتے ہیں اس پر تاریک غلاف چڑھتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک ہم اس روشنی اور ہدایت سے قطعی محروم ہو جاتے ہیں۔ اب اس شمع کو روشن رکھنا تو ہمارا فرض ہے نا؟'' تم نے سوالیہ انداز میں کہا۔

تمہارے باطن کی روشنی تمہاری آنکھوں میں چمک رہی تھی بلکہ انگ انگ بلکہ مسام مسام سے پھوٹ رہی تھی اور میرے دل کی تاریکی میں بھی مدھم سی روشنی جھلملانے لگی اور تاریک غلاف ہٹنے لگے۔

تم کہہ رہی تھیں۔ ''اللہ تعالیٰ نے اتنی خوبصورت کائنات بنائی ہے۔ اتنا بے حساب حسن کہ ساری عمر دیکھتے رہو تو بھی نہ دل بھرے نہ نظریں تھکیں۔ مگر ہم نے عجیب وتیرہ بنالیا ہے کہ برائی اور بدصورتی کو دیکھتے ہیں اور خوبصورتی اور اچھائی کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ کتنی بڑی خوشی سے محروم کر لیتے ہیں خود کو۔''

میں نے تائید میں سر ہلا دیا اور مجھے کچھ تاریک غلاف سرکتے ہوئے محسوس ہوئے اور روشنی واضح ہونے لگی۔

''ہمارے آس پاس کتنے انسان ہیں۔ ہماری رفاقت، محبت اور دوستی کے لیے اور ہم صرف اپنی ذات کے دائرے میں محدود ہو کر ان کی رفاقت و محبت سے خود کو محروم کر لیتے ہیں، خود کو تنہا کر لیتے ہیں۔''

تمہاری یہ بات میرے دل میں تیر کی طرح لگی۔ اس خسارے کو مجھ سے بہتر کون جانتا تھا۔

مجھے اپنے ہی گھر میں اولاد اور شوہر کے ساتھ تنہا رہتی ماں یاد آ گئی، جس سے میرے باپ نے کبھی محبت کی تھی، شادی کی تھی، گھر بسایا تھا۔ اور پھر وہ اپنے کاروبار میں ایسے مگن ہوئے کہ انہیں اور کچھ یاد ہی نہیں رہا۔ انہیں کاروبار کے بڑھتے ہوئے امکانات دریافت کرنے اور پھر انہیں چیلنج بنا کر جیتنے کے بعد کامیاب ہونے کی بڑی لگن تھی۔ دولت میں بے

شک اضافہ ہو رہا تھا مگر غالباً انہیں دولت جمع کرنا مقصود نہیں تھا۔ وہ اپنے کام میں اتنے مصروف اور مگن رہتے کہ انہیں اس دولت سے سطحی خوشیاں خریدنے اور عیاشی کرنے کا کبھی خیال تک نہ آیا۔ مگر مما اب صرف گھر کی دیگر سہولیات میں سے ایک بن کر رہ گئیں۔

ایک مخصوص انداز میں چلتے ہمارے گھرانے کے لیے پیار محبت ایک ایسی اضافی چیز تھی جس کی ہماری زندگیوں میں نہ گنجائش تھی نہ ضرورت۔ ایک ہی گھر میں ہم تین افراد اپنے اپنے ڈھنگ سے رہتے رہے۔

اور پھر ایک دن مما اپنے جذبات و احساسات کی ان کہی داستانیں اپنے ساتھ لیے چپ چاپ خاموشی اور تنہائی کے زندان سے چھوٹ گئیں۔ ان کا اچانک ہارٹ فیل ہو گیا تھا...... اور پاپا جنہوں نے مما کی ذات کا کبھی نوٹس ہی نہیں لیا تھا (کم از کم ہوش سنبھالنے کے بعد میں نے تو یہی دیکھا تھا) خود کو بہت تنہا محسوس کرنے لگے اور اداس رہنے لگے۔ گو ہم نے ہاؤس کیپر رکھ لی تھی اور بظاہر ہمارے آرام سکھ میں کوئی فرق نہیں آیا۔ مگر مما کے خاموش وجود سے بھرا بھرا گھر اب بالکل ویران لگتا۔ ہر چیز مکمل ہونے پر بھی ادھوری لگتی۔

پاپا نے خود کو پہلے کی طرح کاروباری مصروفیات میں گم کر دینے کی کوشش کی مگر ان کا دھیان بھٹک بھٹک جاتا جس کی وجہ سے ان سے اکثر غلط فیصلے سرزد ہونے لگے۔ ان کا اپنی ذات پر اعتماد متزلزل ہونے لگا، دماغی حالت ابتر ہوتی چلی گئی اور سال بھر بعد وہ بھی سدھار گئے اور میں بالکل تنہا رہ گیا کہ اپنے والدین کی واحد اولاد تھا۔

''ہاں یہ حقیقت ہے، ہم خود کو رفاقتوں سے محروم کر لیتے ہیں۔'' میں نے یادوں کے سفر سے لوٹتے ہوئے تائید کی۔

تم تھوڑی دیر خاموش رہیں اور پھر تمہارے چہرے کے نقوش میں ایک دکھ سا گھل گیا۔

''اور یہ بھی حقیقت ہے کہ دنیا میں بہت دکھ ہے، بیماری، ناداری اور جہالت ہے اور ان کے سبب سے مشکلات ہیں، مصائب ہیں۔''

'ہاں'' میں نے تمہارے صبیح پر چھائے تاریک بادل میں گم ہوتے ہوئے غائب دماغی سے کہا۔

''میرے اندر ایک اضطراب ہے، بے چینی ہے، مجھے اپنے وجود کا جواز نہیں ملتا۔ کاش

میرے اختیار میں کچھ ہوتا، کاش میں کچھ کر سکتی۔'' تمہاری آنکھوں میں نمی چمکی۔ اور پھر تمہارا اضطراب میرے اندر آن بسا۔

اتنے میں گھنٹی بجی، تم اٹھ گئیں۔ نیلم بھابی اور ارشد لوٹ آئے تھے۔

ارشد نے معذرت کی۔ بھابی چوٹ کی وجہ سے بیٹھی رہیں۔ تم چائے بنا لائیں اتنے سلیقے اور نفاست سے کہ میں حیران رہ گیا، تم جیسی لڑکی سے میں اس کی بالکل توقع نہیں کر رہا تھا۔

ارشد نے کہا۔ ''دیکھو، تو تم اسے پہلے بھی مل چکے ہو اور آج غالباً تعارف بھی ہو چکا ہوگا مگر میں ایک مہذب آدمی کا فرض نبھاتے ہوئے رسمی تعارف کرانا ضروری خیال کرتا ہوں اور پھر اس نے بناوٹی پر تکلف لہجے میں میری طرف قدرے جھکتے ہوئے کہا۔

''آپ ہیں افراسیاب، میرے ہم جماعت اور پرانے دوست، آسٹریلیا سے، حالانکہ انہیں ایران سے ہونا چاہیے تھا۔ یہ وہاں کاروبار کرتے ہیں حالانکہ انہیں پہلوانی کرنی چاہیے تھی۔'' وہ انتہائی سنجیدہ لہجے میں میرے نام کی رعایت سے خاکہ اڑا رہا تھا۔

پھر وہ تمہاری طرف مڑا۔ ''آپ ہیں تسکین، حالانکہ نیلم کی بھانجی ہونے کی رعایت سے ان کا نام اضطراب ہونا چاہیے، ایم اے کے امتحان سے فارغ ہو کر نتیجے کا انتظار کر رہی ہیں۔ حالانکہ اپنے طور اطوار کے لحاظ سے انہیں ان پڑھ ہونا چاہیے تھا۔ خانہ داری میں بہت اچھی ہیں اور ان سے کام لینے کے لیے ہی نیلم نے پاؤں توڑ لیا ہے۔''

ہم سب ہنسنے لگے اور ایک بے تکلف سی فضا پیدا ہو گئی۔

''تم سچ مچ تسکین ہو۔'' میں سوچ رہا تھا۔

پھر ارشد کے ہاں میرے چکر پھیرے کچھ زیادہ ہی ہو گئے۔ نیلم بھابی کی تیز نظروں نے بھانپ لیا لیکن وہ مزاحم نہ ہوئیں۔ تم اپنا رکھ رکھاؤ قائم رکھتے ہوئے بے تکلف بات کر لیتیں۔

ایک روز میں نے تمہیں یاد دلایا۔ ''آپ نے کائنات کا حسن بے حساب دیکھا ہے، مجھے بھی دکھائیں۔''

''ہاں ضرور دکھاؤں گی۔'' تم نے اپنی اسی فطری سادگی سے کہا۔

جانے کے لیے اگلا دن طے ہو گیا۔

میں گاڑی لے کر پہنچ گیا۔ ارشد تو اپنے کام دھندے میں الجھا ہوا تھا۔ صرف نیلم بھابی

اور تم نے ساتھ جانا تھا۔ بھابی نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔" بھائی ابھی مجھ سے زیادہ چلا پھرا نہیں جاتا، تم ہو آؤ...... ویسے بھی مجھے معلوم ہے یہ تمہیں کہاں لے جائے گی، ہزار بار دیکھ چکی ہوں۔ معلوم نہیں اس کو اس جھاڑ جھنکار میں کیا دکھائی دیتا ہے۔"

انہیں تم پر اعتماد تھا اور تمہیں خود پر۔ تم فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھیں۔ تمہاری موجودگی نے میرے اندر ایک میٹھی میٹھی سی بے چینی، ایک سرشاری سی بھر دی تھی۔ تم خاموش تھیں اور میں نے اپنے وجود میں جاگتے اجنبی احساس سے گھبرا کر سی ڈی پلیئر آن کر دیا۔

"آج ہم فطرت سے ملنے آئے ہیں، اسے دیکھنے، اسے سننے۔" تم نے مسکراتے ہوئے اپنے مدھم میٹھے لہجے میں کہا۔

"یہ پوری کائنات ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہے اور ہم بھی اسی کا حصہ ہیں۔ یہ پیڑ، پودے، پھول، خوشبو، ہوا، بارش، روشنی، تاریکی سب ہم سے ہم کلام ہوتے ہیں۔ مگر ہم مصنوعی شور و شغب میں گم ہو کر ان کی لطیف زبان کو سمجھنے کی صلاحیت سے عاری ہو جاتے ہیں۔

حیرت ہے، ہم کروڑوں، اربوں برس کی دوری پر چمکتے ستاروں کے اثرات کو تو اپنی زندگیوں پر تسلیم کرتے ہیں مگر پاس کی چیزوں کو بھول جاتے ہیں۔"

تمہیں جاننا ہر لمحے نئی حیرت تھی۔

کھڑکیوں کے شیشے نیچے کرتے ہی لطیف آوازوں کا میٹھا شور اندر گھس آیا۔ میں تمہاری موجودگی کے احساس سے تو باخبر تھا۔ مگر ان آوازوں نے مجھے اپنے اندر جذب کر لیا۔ گلابی رنگ میں ڈوبے عنابی سورج کی درختوں کی چوٹیوں میں جگنو جگاتی کرنوں کے ملائم اجالے میں چاندی کے ننھے منے گھنگھروؤں کی دھیمی دھیمی مدھر جھنکار نے مجھے مدہوش کر دیا اور مجھے لگا تھا میں یہ منظر پہلی بار دیکھ رہا ہوں، چڑیوں کو پہلی بار بولتے سن رہا ہوں۔

اب ہماری گاڑی مدھم رفتار سے دورویہ درختوں میں گھرے اونچے نیچے بل دار راستے پر چلتی جا رہی تھی کہ تم نے منزل مقصود آ جانے کی نوید دی۔ میں نے گاڑی کنارے پر روک دی اور ہم دونوں باہر آ گئے۔

ہم دونوں پہلو بہ پہلو چل رہے تھے۔ ہمارے قدموں تلے سوکھے پتے چرمرا رہے

تھے۔ کبھی ہوا کا کوئی جھونکا، تمہارے چہرے پر لٹیں بکھیر دیتا تو بڑی آہستگی سے بالوں سنوارتے ہوئے تمہارے چہرے پر ایک نرم سی مسکراہٹ پھیل جاتی جیسے جھونکے کی شرارت پر پیار آ رہا ہو۔

اب ہم قدرے بلندی پر ایسی جگہ تھے جہاں اونچی نیچی مختلف سطحوں پر کاسنی گچھے دار پھولوں کی پست قد جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں، پھولوں کی دھیمی دھیمی مہک ہوا میں رچی ہوئی تھیں۔

''اس شہر میں یہ میری پسندیدہ ترین جگہ ہے۔ آپ نے دیکھا یہ سب کیسے چپ چپ الگ الگ سے لگ رہے تھے۔ یہ سکوت، یہ فاصلہ دوری اور اجنبیت نہیں۔ اپنی اپنی خوشبو میں ڈوبے ہوئے، اپنی ذات میں اترے ہوئے جانتے ہیں کہ یہ تنہا نہیں۔ یہ ایک دوسرے کی موجودگی کے احساس سے سرشار ہیں۔ یہ خاموشی وہ گفتگو ہے جو لفظوں کی محتاج نہیں، یہ اپنے معانی و مفاہیم سمیت براہ راست دل سے دل اور روح سے روح تک سفر کرتی ہے اور یہ وہ قرب ہے جو لمس کا محتاج نہیں۔ میں جب بھی اداس ہوتی ہوں، یہاں آ جاتی ہوں۔ یہ مجھے پہچانتے ہیں، انہوں نے مجھے خود میں شامل کر لیا ہے۔ میں انہی میں سے ایک بن جاتی ہے۔ یہ بھید بھرا کاسنی رنگ اپنے اندر بہت سے اسرار چھپائے ہوئے ہے۔ میں نے ان کی ساری گفتگو ئیں سنی ہیں۔ میں ان کے سارے بھید جانتی ہوں۔ یہ میرے دل کی ساری اداسی اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں اور میں ہلکی پھلکی تازہ دم ہو کر لوٹ جاتی ہوں۔''

تم...... معلوم نہیں کیسی طلسماتی فضا تانتی جا رہی تھیں اور میں گویا تنویمی کیفیت میں تھا۔

اس وقت تو میں سب کچھ تمہارے کانوں سے سن رہا تھا، تمہاری آنکھوں سے دیکھ رہا تھا، مگر اب فطرت میری بھی دوست بن گئی ہے۔ میں بھی اس کی ساری باتیں سنتا، سمجھتا اور لطف اندوز ہوتا ہوں۔ تم نے مجھے کتنی بڑی لذت سے آشنا کیا ہے۔ تم کہتی ہوتا کہ کائنات کی ہر شے ذی روح ہے۔ مگر ہر ایک کی روح مختلف طرح کی ہے۔ اب تو میں بھی اس کی تردید نہیں کروں گا۔

میں نے ایک مردہ میکانکی ماحول میں آنکھ کھولی تھی سو اسی کا حصہ بن گیا۔ نہ کوئی مشغلہ، نہ شوق...... بس ایک بے حد منظم و مرتب انداز میں گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ چلتے ہوئے جینے کا تسلسل۔ میرے مردہ دل کو جس معجزے نے زندہ کیا وہ معجزہ تم ہو تسکین!

والدین کے انتقال کے بعد میں اب بالکل اکیلا رہ گیا تھا۔ لہٰذا کاروباری مصروفیات اور ذمہ داریاں بڑھ گئیں۔ نئے نئے چیلنج قبول کرنے، ان سے نمٹنے اور فتح یاب ہونے کا اپنا ایک نشہ ہوتا ہے۔ پاپا سے یہ لت مجھے بھی لگ گئی تھی۔ میں اس میں الجھا رہا۔ میری عمر بڑھتی جا رہی تھی مگر مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔

ارشد میرا دوست اور ہم جماعت ہے۔ یہ انجینئرنگ پڑھنے آسٹریلیا گیا۔ اس کے مزاج کی ہمہ گیریت نے مجھے اپنے اندر جذب کر لیا اور دکھ سکھ میں کام آ کر اس نے صحیح معنوں میں خود کو دوست ثابت کر دیا۔ میرا اس سے رابطہ رہتا۔ وہ مجھے وطن آ کر یہیں پر کاروبار کرنے اور شادی کرنے پر اکساتا رہتا۔ میں اس سے ملنے تو چلا آیا مگر میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں وہاں پیدا ہوا، پلا بڑھا تھا، یہ جگہ میرے لیے وہاں سے زیادہ اجنبی تھی۔ مگر تمہیں دیکھنے کے بعد میرا قیام طویل ہوتا گیا۔ میرا پروگرام تبدیل ہو گیا۔

ارشد نے مجھے تمہارے متعلق بتاتے ہوئے کہا تھا کہ "پتہ نہیں تم کس مٹی کی بنی ہوئی ہو۔" اور میں جان چکا ہوں کہ سچائی اور معصومیت کو محبت میں گوندھ کر تمہیں بنایا گیا ہے۔

اس نے مجھے بتایا کہ تم اپنے والدین کی پہلی اولاد تھیں اور اپنی پیدائش کے روز ہی ماں سے محروم ہو گئی تھی۔ سوتیلی ماں کی سنگدلی اور سختی اور سگے باپ کی لاپروائی اور بے حسی کو تم نے جس خندہ پیشانی سے سہا ہے، وہ حیران کن ہے۔ اس کے باوجود نہ تم نے کبھی خود کو مظلوم سمجھا اور نہ تمہارے مزاج میں تلخی آئی۔ سوتیلے بہن بھائیوں سے جس طرح ٹوٹ کر پیار کیا، ان کی پرورش و خدمت کی، اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ تمہاری سوتیلی ماں نے تمہاری تعلیم کے راستے میں بھی رکاوٹ بننے کی کوشش کی کہ وہ ایک بے زبان خادمہ کی خدمت سے محروم نہیں ہونا چاہ رہی تھی لیکن جب تم نے خود پر محنت بڑھا لی مگر خدمت میں کوئی فرق نہ آنے دیا تو وہ بھی خاموش ہو گئیں۔ تم نے اپنی ذہانت اور محنت سے پوری تعلیم اعزاز و وظائف کے ساتھ مکمل کی، جس نے تمہیں خود اعتمادی کی دولت سے مالا مال کر دیا۔

وہ اگر یہ سب نہ بھی بتاتا تو بھی میں جانتا تھا کہ خالقِ کائنات جسے تم جیسی الوہی صفات دیتا ہے ان کے پاس سمندروں سے دل اور پہاڑوں سا جگر بھی ہوتا ہے۔ انہیں وہ اس دنیا پر انعام کرتا ہے تاکہ وہ دنیا کی تاریکی میں اپنے منور وجود سے روشنی پھیلائیں، جن کے دل کی

وسعتیں ہر اندازے سے ماورا ہوتی ہیں اور جن میں دکھی انسانیت کے سارے درد و غم جذب کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔

میں جانتا ہوں وسائل کی کمی تم جیسے جذبوں سے مالا مال لوگوں کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتی جس طرح کسی راہ گیر کے ہاتھ یا پرندے کی چونچ سے گرے ہوئے ایک بیج سے درخت اور اس سے جنگل بنتے چلے جاتے ہیں۔ اسی طرح تمہارے ایثار و قربانی اور محبت میں رچے وجود کی خوشبو تقسیم در تقسیم ہوتی صندل کے جنگل اگاتی چلی جائے گی، ماحول کو مہکاتی چلی جائے گی۔

دیے سے دیے جلتے اور روشنی کے کارواں بنتے چلے جائیں گے۔

کیا تم روشنی کے اس سفر میں مجھے اپنے ساتھ چلنے کی عزت و مسرت بخشنا پسند کرو گی؟

ایک انہماک سے افراسیاب کی باتیں سنتی تسکین پر اس کے آخری جملوں نے عجیب ہی اثر کیا۔ اب تک یہ ہوتا آیا تھا کہ بے رخی، بے حسی اور طعن و طنز کے جلتے پتھر اس کے وجود سے ٹکراتے تو اس کا صبر و ضبط انہیں برف میں تبدیل کر دیتا جو آہستہ آہستہ پگھل کر اس کے وجود کے اندر جذب ہو جاتے۔ افراسیاب کے آخری جملے نے اس کے وجود میں جذب دکھوں کے دریا میں طوفان بپا کر دیا۔ گہرے پانیوں میں ڈوبتی تسکین کی سانس اکھڑنے لگی، دم گھٹنے لگا۔

اس کی اس بدلتی کیفیت سے گھبرا کر افراسیاب نے بے اختیار اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ تسکین نے آہستگی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور نظریں اُس کے چہرے پر گاڑ دیں۔

اُن نظروں میں نجانے کیا تھا کہ افراسیاب نے گھبرا کر آنکھیں جھکا لیں اور پھر جیسے گہرے پانیوں میں سے اس کی آواز ابھری۔ وہ آواز وہ لہجہ اتنا مختلف اور نامانوس تھا کہ اُس نے چونک کر نظریں اٹھائیں اور وہاں ایک دوسری لڑکی تھی جسے وہ آج پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ شگفتہ چہرے والی ہنستی مسکراتی تسکین کے بجائے سراپا درد کی تجسیم تھی اور پھر جیسے زخم میں سے اٹھتی ٹیس بولی۔

''تو تم نے بھی دوسروں کی طرح صرف وہی دیکھا اور سمجھا جو بیرونی سطح پر ہے۔ کیا میں زندگی بھر خوش رہنے کی اداکاری کرتی رہوں؟''

اُس نے چند ثانیے خاموش رہنے کے بعد نظریں ایک بار اس کے چہرے پر جما دیں۔

اُس کی جلتی چھلکتی آنکھوں میں ایک سوال ابھرا۔ وہ گھٹی گھٹی آواز میں بولی'' کیا مجھے اصل وجود کے ساتھ جینے کا حق نہیں؟''

غرورِ عشق کا بانکپن

وہ قصے کہانیوں جیسی رات تھی۔ چاروں طرف سناٹے کا راج تھا۔ اندھیرا بھیگے ہوئے کمبل کی طرح بھاری اور گہرا تھا۔ روشنی اور تاریکی باہم دگر دست و گریباں تھے۔ کار کی ہیڈ لائٹس کی روشنی اندھیرے کو چیر کر بمشکل چند قدم آگے بڑھتی کہ اندھیرا اسے نگل لیتا۔ تنگ سڑک کے دونوں طرف قطار در قطار گھنے درخت تھے اور دور کہیں کسی گھر کی ٹمٹماتی روشنی کسی درویش کی کٹیا میں جلتے چراغ کی طرح محسوس ہوتی۔

وہ دونوں ایک مشترک دوست کی سالگرہ کی پارٹی سے واپس آرہے تھے۔ مگر اس گہری تاریک رات کی پراسراریت نے ان دونوں کو اپنے سحر میں جکڑ رکھا تھا۔ دونوں بالکل خاموش تھے اور یہ اعصاب شکن خاموشی باہر کے بھیگے ہوئے اندھیرے کی طرح انہیں ڈھانپے ہوئے تھی۔ اچانک گاڑی کے بریک چیخے اور کاسمو کا سر ڈیش بورڈ سے جا ٹکرایا۔ بے اختیار ایک گھٹی ہوئی چیخ اس کے منہ سے نکلی اور سنبھل کر اس نے دیکھا۔ ایک ہرن ایک ادائے بے نیازی سے ادھر ادھر دیکھتا ٹہلتا ہوا سڑک پار کر رہا تھا۔

''معاف کرنا یار، سڑک خالی پڑی تھی اس لیے رفتار از خود بڑھ گئی اور ڈیئر کراسنگ کے نشان پر میری نظر ہی نہیں پڑی۔ شکر ہے ہرن پر بروقت نظر پڑ گئی۔ ایک سیکنڈ بھی دیر ہو جاتی تو ہم اس غزالِ آوارہ کی ادائے بے نیازی پر قربان ہو چکے ہوتے۔''

"یعنی ایک بار پھر......" کاسمو نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

وسیلین کی پیشانی پر شکنیں ابھریں اور اس نے قدرے حیرانی سے کاسمو کو دیکھا اور پھر اس کے اشارے کو سمجھ کر مسکرا دیا۔

"ایک بار پھر کی بھی خوب کہی۔"

"یار، وہ غزال آنکھوں والی اب بھی تمہیں یاد آتی ہے؟"

"یاد......؟" وہ ہنسا۔ "وہ تو میری نس نس میں سمائی ہوئی ہے۔"

"یار، تم سے اس موضوع پر بات کرو تو لگتا ہے لوک کہانیوں کا کوئی کردار کتابوں میں سے باہر نکل آیا ہے۔ ویسے کہانی تو تمہاری بھی لوک داستان بننے کے لائق ہے۔"

"اپنے ایسے نصیب کہاں؟"

"کیوں؟"

"دنیا میں ہر کوئی اپنی سوچ اور استطاعت کے مطابق محبت کرتا ہے۔ بہت سے لوگ پوری سچائی اور گہرائی سے محبت کرتے ہیں۔ مگر تم نے کبھی غور کیا کہ ہر معاشرے میں لوک داستانیں انگلیوں پر گنی جاسکتی ہیں۔ کیونکہ عشق لاکھوں کروڑوں میں سے کوئی ایک کرتا ہے اور لوک داستان بننے کا اعزاز صرف عشق کی کہانیوں کو ملتا ہے۔ اور تمہیں تو معلوم ہے کہ کسی کہانی کو لوک داستان بننے میں صدیاں لگتی ہیں۔"

"تو گویا یہ کوئی روحانی تجربہ ہے۔"

"ہاں......شاید"

"تو تمہیں بھی عشق تھا اس غزال رم خوردہ سے۔"

"عشق تھا نہیں، ہوتا ہے......ایک بار ہو گیا تو ہو گیا۔"

"تمہاری محبوبہ......"

"نہ ناں، یہ عامیانہ لفظ اس کے لیے استعمال نہ کرو۔"

"واہ رے مجنوں!" کاسمو نے قہقہہ لگایا۔

وہ بھی اس کے قہقہے میں شامل ہو گیا۔

کاسمو کا گھر آ گیا اور وہ اسے الوداع کہہ کر اتر گیا۔ مگر اس نے اس موضوع پر بات کر

کے دبی ہوئی چنگاری کو ہوا دے دی تھی۔

کتنے برس ہو گئے......اب تو اسے ٹھیک سے یاد بھی نہیں۔ وہ تو اس طرح اس کی ذات کا حصہ بن گئی ہے کہ اسے خود سے الگ کر کے یاد کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ کبھی وہ اس کی آنکھوں میں مسکراتی ہے تو کبھی دل میں چٹکی لیتی ہے اور کبھی چپ چاپ اس کے اندر سانس لیتی رہتی ہے۔

''کتنے برس ہو گئے ہیں؟'' اس نے ڈائری سے پوچھا۔

''پندرہ برس'' ڈائری پر لکھی تاریخ نے سرگوشی کی۔

''پندرہ برس'' اس نے دہرایا اور ایک اداس سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔ اس نے آہو کو پہلی بار رجسٹریشن آفس میں دیکھا تھا۔ وہ دھڑا دھڑ کلاسیں رجسٹر کرائے جا رہی تھی۔

''یہ کچھ زیادہ نہیں ہو جائے گا۔'' رجسٹریشن کلرک نے سمجھانا چاہا۔

''نہیں، میں مینج (Manage) کراوں گی۔'' اس نے بڑے اعتماد اور قطعیت سے کہا۔

اس نے جاتے جاتے ایک قہر بھری نگاہ اس پر ڈالی اور آفس سے نکل گئی۔

یہ تو نہیں کہ ویسی آنکھیں دنیا میں اور کسی کی نہ ہوں گی۔ مگر اس نے ایسی آنکھیں زندگی میں پہلی بار دیکھی تھیں۔ کھلی کھلی، گہری گہری، بھوری آنکھیں، سمندر، جھیل، آسمان، جگنو، تارے، موتی، وہ سب تشبیہیں ذہن میں لایا مگر کچھ جچا نہیں۔ ہاں ان آنکھوں کی معصوم وحشت ہرنی جیسی تھی۔

یوں اس کا مجموعی سراپا بھی دلکش تھا۔ وہ درمیانی قامت کی نازک سی خوبصورت لڑکی تھی مگر آنکھیں اس کی پوری شخصیت پر چھائی ہوئی تھیں۔

پھر وہ وقتاً فوقتاً کیمپس میں دکھائی دینے لگی لیکن اس کا نہ اس سے تعارف ہوا اور نہ علیک سلیک۔

ان دنوں وہ اپنا پی ایچ ڈی کا تھیسس دے چکا تھا اور صرف اس کے منظور ہونے کے انتظار میں بیکار پھر رہا تھا۔ اس لیے کبھی کہیں جا بیٹھتا کبھی کہیں۔ اسی طرح وہ ایک دن انتھروپولوجی کی کلاس میں جا بیٹھا۔ وہ بھی اس کلاس میں تھی۔ پروفیسر اسے متنبہ کر رہا تھا کہ وہ اپنی پوری اسائنمنٹس Submit کرائے بغیر امتحان نہیں دے سکتی۔ جواباً وہ گھبرائی ہوئی کہہ

رہی تھی کہ وہ ذہنی طور پر بہت پریشان ہے۔ اس کے بہت سے مسائل ہیں۔ اسے تھوڑی مزید مہلت چاہیے۔ وہ آفس میں اس سے مل کر پوری تفصیل بتانا چاہتی ہے۔

پھر اسے مختلف ڈیپارٹمنٹس میں اس کے متعلق مختلف داستانیں سننے کو ملیں۔ ہر داستان اپنی جگہ جبر واستحصال اور دکھوں کی مکمل داستان تھی۔ سب کو اس سے انتہائی ہمدردی تھی۔ مگر اسے لگا کہ یہ سب داستانیں فرضی ہیں۔ اس نے ایک صاحب کمال کہانی کار کی مہارت سے ہر کہانی کی بنت بہت باریکی اور گہرائی سے کی تھی۔ کہیں کوئی جھول نہیں تھا کہ جھوٹ کا گماں ہو۔

گماں تو اسے بھی نہ ہوتا اگر اس نے اسے کلاسیں رجسٹر کراتے نہ دیکھا ہوتا۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔ وہ بلاشبہ ایک بے حد ذہین لڑکی تھی مگر حقیقت پسند نہیں تھی۔ ورنہ یوں اپنا وقت، پیسہ اور دماغ ضائع نہ کرتی۔ کچھ کلاسیں ڈراپ کر کے کوئی ایک میجر اعزاز کے ساتھ مکمل کر لیتی۔ وہ اپنا ذہن یوں بہانے بازیوں میں ضائع کر رہی تھی مگر پھر بھی اپنی روش ترک نہیں کر رہی۔ اسے افسوس ہوا، اس کا دل چاہا وہ اسے سمجھائے مگر کچھ روز سے وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

وہ لابی میں کھڑا تھا کہ انگلش ڈیپارٹمنٹ کے ایک سٹوڈنٹ نے اسے کہا۔ "اگر آپ مصروف نہیں ہیں تو آپ فائن سائیڈ لاؤنج میں ایک سیمینار میں شرکت کیجئے۔ یہ بنیادی انسانی حقوق اور خصوصاً عورتوں کے حقوق کے تحفظ کے سلسلے میں ہے۔ یہ ہمارے ڈیپارٹمنٹ کی ایک لڑکی کے حوالے سے ہے۔" اس نے بڑی سنجیدگی سے پروگرام کی غرض وغایت بتائی۔

"ضرور آؤں گا۔" اس نے وعدہ کر لیا۔

"شکریہ جناب" کہہ کر وہ سٹوڈنٹ آگے بڑھ گیا۔

ابھی وہ وہیں کھڑا تھا کہ ایک اور لڑکا اسے ایک فلائر تھما کر آگے بڑھ گیا۔ وہ فلائر بھی اسی سیمینار کے متعلق تھا۔ اس کی دلچسپی اور بڑھ گئی۔

وہاں جا کر پتہ چلا کہ آ ہو ایک ذہین لڑکی ہے۔ وہ ایک پسماندہ یا ترقی پذیر ملک پاکستان سے تعلق رکھتی ہے۔ اس میں بے پناہ صلاحیتیں ہیں۔ وہ پڑھنا چاہتی ہے، آگے بڑھنا چاہتی ہے مگر بدقسمتی ہے اس نے ایک ایسے معاشرے میں جنم لیا ہے۔ جہاں آج بھی دور تاریک کے رسم ورواج رائج ہیں۔ جہاں عورت صرف ایک شے ہے، جنس ہے، جسے اپنی

ہی زندگی پر کوئی اختیار نہیں۔ جہاں شادی سے پہلے اس کی زندگی کے فیصلے باپ کرتا ہے اور شادی کے بعد شوہر...... مگر اب آہو ایک آزاد ملک کی آزاد شہری ہے اور اس کے حقوق اس سے نہیں چھینے جا سکتے۔ وہ اپنی بیمار ماں کی خدمت کرنے اور چھوٹے بہن بھائیوں اور گھر کو سنبھالنے کے لیے والدین کے ساتھ رہ رہی ہے۔ جس سے اس کی تعلیم متاثر ہوتی ہے۔ مگر وہ اپنی انسانیت دوست فطرت کی وجہ سے بخوشی یہ کام سرانجام دے رہی ہے۔ یہاں تک تو بات پھر بھی درست تھی۔

مگر اب اس کے والدین اس کی شادی اس کی مرضی کے خلاف کسی ان دیکھے انجانے شخص سے کرنا چاہتے ہیں۔ ابھی وہ ذہنی طور پر شادی کے لیے تیار نہیں ہے۔ وہ اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہتی ہے اور وہ کسی انجان شخص سے شادی کرنے پر ہرگز تیار نہیں اور یہ اس کا بنیادی حق ہے۔

اگر اس کے ساتھ زبردستی کی گئی تو انسانی حقوق کے تحفظ کی خاطر ہمیں دخل دینا ہوگا اور آہو کو بچانا ہوگا۔ سب نے تائید کی اور وعدہ کیا۔

انہوں نے خدشہ ظاہر کیا کہ کچھ روز سے وہ کالج سے غیر حاضر ہے۔ کہیں اسے زبردستی مجبور نہ کیا جا رہا ہو۔ یہاں ضرور اس کے کچھ دوست ایسے ہوں گے جن سے وہ رابطے میں ہوگی یا وہ رابطہ کر سکتے ہوں گے۔ وہ اسے بتا دیں کہ وہ تنہا نہیں ہے اور انسانی حقوق کی جنگ میں ہم اس کے ساتھ ہیں۔"

اور اتفاق دیکھیے کہ اسی شام وہ اسے Wegman میں نظر آ گئی۔ اس کی بھی ضرور اس پر نظر پڑی ہوگی مگر وہ غالباً قصداً سٹور میں ایسی گم ہوئی کہ اسے تلاش کرنے پر بھی دکھائی نہ دی۔ مگر اب انتہا ہو گئی تھی۔ آج کی میٹنگ میں شریک ہونے کے بعد وہ اسے ہر صورت ملنا چاہتا تھا۔

اور پھر حل اس کی سمجھ میں آ گیا۔ وہ سامان خریدے بغیر باہر آ گیا۔ پارکنگ لاٹ میں اس نے آہو کی گاڑی پہچان لی۔ اسے اس کی گاڑی کی پہچان ہونے کی ایک الگ داستان ہے۔

ایک روز جب وہ اپنی گاڑی پارک کر رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ پولیس ایک سفید

سپورٹس کار کو بوٹ لگا رہی تھی۔ اس کے استفسار پر ہوم سکیورٹی آفیسر نے بتایا کہ یہ کار ہمیشہ کسی نہ کسی غلط سپاٹ پر کھڑی رہتی ہے۔ ہم مسلسل ٹکٹ دیتے رہے مگر کار کی مالکہ یا مالک نے کوئی پرواہ نہ کی، نہ جرمانے کی ادائیگی کی اور نہ کبھی سکیورٹی سے رجوع کیا۔ گاڑی اب بھی غلط سپاٹ پر کھڑی ہے۔ جلدی میں کار اونر کو جو بھی جگہ ملتی ہے وہیں گاڑی پارک کر دیتا ہے یا کر دیتی ہے اب جرمانے کی رقم سات سو ڈالر سے تجاوز کر گئی ہے اس لیے وہ یہ اقدام کر رہے ہیں۔ آج یا تو آفس بند ہونے سے پہلے وہ ہم سے رجوع کرے اور ادائیگی کرے ورنہ یہ گاڑی پولیس ڈیپارٹمنٹ میں چلی جائے گی اور اسے اپنا کیس کورٹ میں لڑنا ہوگا۔

پارکنگ لاٹ عبور کر کے اندر داخل ہونے سے پہلے اس نے یونہی پلٹ کر دیکھا تو وہ آفیسر سے بات کر رہی تھی۔ وہ یقیناً اسے کوئی نئی داستان سنا رہی ہوگی۔ اگر وہ ادائیگی نہ کر پائی تو یقیناً وہ کورٹ میں اپنا کیس لڑنے کی اہلیت رکھتی تھی۔ بس اس کے پاس کمی تھی تو وقت کی۔ اس کی دلچسپی اس میں روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔

وہ اس کی گاڑی سے کچھ فاصلے پر اس کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ آتی دکھائی دی۔ وہ دوسری گاڑی کی اوٹ میں ہو گیا۔ اس سے کچھ بعید نہ تھا کہ اس کے سامنا کرنے سے بچنے کے لیے وہ گاڑی وہیں چھوڑ کر کہیں آس پاس غائب ہو جائے۔

جیسے ہی وہ گاڑی کے قریب پہنچی وہ ایک دم سامنے آ گیا۔ ایک لمحے کو وہ گڑبڑا گئی۔ پھر سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پراعتماد لہجے میں قدرے تختی سے بولی۔ ''کیا بات ہے؟''

''مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔''

''کیا میں آپ کو جانتی ہوں؟''

''مگر میں آپ کو جانتا ہوں اور ابھی وہ سیمینار اٹینڈ کر کے آیا ہوں جو آپ کی حمایت میں کیا گیا ہے۔''

''اوہ...... اچھا!'' اس نے ایک گہرا سانس لیا۔

''مگر میں جانتا ہوں، یہ سب جھوٹ ہے۔''

ایک لمحے کو اس کے چہرے کا رنگ بدلا۔

''میں جانتا ہوں کہ یہ اور باقی کی ساری کہانیاں سب جھوٹ ہیں۔ حقیقت صرف اتنی

ہے کہ آپ نے بہت زیادہ کلاسیں لے لی ہیں جواب آپ مینج نہیں کر پا رہیں۔ اس وقت غالباً آپ کو اندازہ نہیں تھا کہ صرف کلاسیں اٹینڈ کرنا ہی کافی نہیں ہوتا، ان کے لیے ہوم ورک کرنا اور ٹیسٹوں کی تیاری بھی کرنی ہوتی ہے۔"

"یہ میرا ذاتی معاملہ ہے، آپ کو کیا مسئلہ ہے..... آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟" اس کے انداز میں تلخی تھی۔

"میں صرف یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ آپ اپنی ذہنی توانائیاں ان داستانوں کو گھڑنے اور پھر ان کا تسلسل برقرار رکھنے پر ضائع کرنے کے بجائے لگ کر وہ کام ہی کر لیں جو موخر ہوتے جا رہے ہیں، تو زیادہ بہتر ہے۔"

اس نے اپنی صفائی میں کچھ نہ کہا۔ "نصیحت کے لیے شکریہ" کہہ کر وہ گاڑی کی طرف بڑھی۔

"معاف کیجئے..... میرا مقصد نہ آپ کو آئینہ دکھانا تھا نہ نصیحت کرنا، میں صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ آج کل میرے پاس بہت سا فالتو وقت ہے۔ میں آپ کے کام میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔ یہ بات صرف میرے اور آپ کے درمیان رہے گی۔ یہ ایک شریف آدمی کا وعدہ ہے۔"

چند لمحے وہ بے یقینی سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر بچوں کی طرح چہک کر بولی۔ "پرامس؟"

"پرامس" میں نے یقین دلایا۔

مزید وقت ضائع نہ کرنے کے لیے اسی شام "بارنز اینڈ نوبلز" میں ملنا طے ہو گیا۔ بک سٹور کے ایک پرسکون گوشے میں بیٹھ کر انہوں نے کام کا جائزہ لیا۔ فہرستیں بنائیں اور انہیں ڈیڈ لائنز کے مطابق ترتیب دیا۔ اتنا پینڈنگ کام دیکھ کر ایک بار تو اسے بھی چکر آ گیا۔ دراصل یہی بے ترتیبی ہی اس کی کمزوری تھی۔ ڈیڈ لائنز گزر جاتیں اور اسے یاد ہی نہ ہوتا۔

اس نے اعتراف کر لیا کہ بہانوں کی خاطر گھڑی گئی ساری کہانیاں جھوٹی ہیں۔ وہ ایک اچھے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتی ہے اور اس کے والدین اپنی مذہبی روایات اور کلچر کے حساب سے متوازن ذہن رکھتے ہیں۔ وہ بہت Ambitious مگر لاپرواہ اور بھلکڑ ہے اور یہی اس کی پریشانی کا سبب ہے۔

وہ چند ماہ وسیلی کی زندگی کا خوبصورت ترین دور تھا۔ اچھی تو وہ اسے پہلی نظر میں ہی لگی تھی۔ وہ اسے جتنا جتنا زیادہ جانتا گیا اتنا اتنا وہ اس کے دل میں اور گہری اترتی گئی۔ وہ بہت سادہ دل اور معصوم تھی۔ اور وہ بے شمار جھوٹ جو اس نے گھڑے تھے اس کی تخلیقی اپج کے آئینہ دار تھے۔

اب وہ اکثر گھر پر کام کرتے۔ جب وہ کلاسوں میں ہوتی تو وہ Chapters پڑھ لیتا اور اسے اختصار سے سمجھا دیتا۔ وہ بڑی تیزی سے اپنا کام مکمل کرنے لگی۔ اگرچہ وقت کی کمی کی وجہ سے اس کے کام کا وہ معیار نہیں جس کو پیش کرنے کی وہ اہل تھی۔ بہر حال اس نے جیسے تیسے سارے کام مکمل کر لیے۔

اب ان کی بے تکلف دوستی ہو گئی تھی۔ وہ کبھی کبھار اس کے ساتھ کھانے پر بھی چلی جاتی۔ وہ دونوں اکٹھے کسی تفریحی مقام پر بھی چلے جاتے اور لطف اندوز ہوتے۔

اس کا تو خیر قصہ ہی اور تھا مگر وہ بھی اس کی کمپنی انجوائے کرتی۔ مختلف موضوعات پر لمبی بحثیں ہوتیں۔ اس کی معلومات کافی وسیع تھیں۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود جو آگ اسے جلا رہی تھی اس کے ادھر کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے بلکہ وہ تو اس کے اندر جلتی آگ کی تپش بھی محسوس نہیں کر پا رہی تھی۔ اسے حیرت ہوتی۔ وہ اتنی ذہین ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اندازہ نہ کر پائی ہو۔ مگر جو بات اسے براہ راست اظہار سے روکتی وہ یہ تھی کہ کہیں وہ یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ وہ اس سے اپنی مدد کرنے کے احسان کا بدلہ چاہ رہا ہے۔ کہیں وہ اس کے خلوص، اس کی چاہت پر شک نہ کر بیٹھے اور اپنی بے لوث، بے ریا محبت کی توہین اسے کسی قیمت پر گوارہ نہ تھی۔

ایک دو موقعوں پر تو اس کی بے اختیاری اس کے انداز سے اتنی واضح تھی کہ اسے سمجھنے کے لیے کسی ذہانت کی بھی ضرورت نہ تھی۔ ایک بار اس نے اسے ایک Concept سمجھانے کے بعد ٹیسٹ کرنے کے لیے چند سوالات کے جواب لکھنے کو کہا۔ وہ نوٹ بک سامنے رکھے ادھر ادھر پنسل تلاش کر رہی تھی، اس نے دیکھا پنسل اس کے بالوں میں اڑسی ہوئی تھی اور جو غالباً اسے بھول گئی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر وہ پنسل نکال لی۔ پنسل نکلتے ہی اس کے گھنے بال یک لخت کسی آبشار کی طرح گر کر اس کے چہرے کے دونوں طرف پھیل گئے۔ ایک آسمانی

مخلوق اپنی تمام تر معصومیت اور حسن کے ساتھ اس کے سامنے تھی۔ وہ مبہوت رہ گیا اور ایک عالم بے خودی میں ایک ٹک اسے دیکھے چلا گیا۔ آہو نے اس پر نگاہ ڈالی۔ اس کی آنکھوں میں لمحے بھر کو حیرت بھری گھبراہٹ ابھری مگر دوسرے ہی لمحے اس نے مسکراتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے بال سمیٹ کر ان میں پنسل پھر سے اڑس لی اور دوسری پنسل سے جو وہ اب ڈھونڈ چکی تھی، سوالات کے جوابات لکھنے میں منہمک ہو گئی۔ وہ اپنی بے اختیار بے خودی پر کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔ مگر وہ نظریں جھکائے اپنے کام میں محو تھی۔

وہ چہرہ، وہ تصویر اس کے ذہن پر اتنی تفصیل سے نقش ہے کہ وہ اسے اسی طرح زندہ اور متحرک دیکھ سکتا ہے۔

ایک اور موقع پر اس نے آہو کو ستارے دکھانے کی پیشکش کی وہ تیار ہو گئی۔ گرمیوں میں جب آسمان کھلا اور موسم صاف ہوتا ہے تو اس خاص مقام پر ستاروں بھرا آسمان کسی شامیانے کی طرح جھک آتا ہے۔ اگر آپ ساحل کی ریت پر لیٹے ہوں تو یوں لگتا ہے کہ جیسے ہاتھ بڑھا کر ستاروں کو مٹھی میں بھرا جا سکتا ہے۔

وہ دونوں پاس پاس ہی ریت پر لیٹے تھے۔ آہو نے ستاروں پر نظریں جمائے مندا سی آواز میں پوچھا۔

''ویلی! کیا تم بھی اس بات پر یقین رکھتے ہو کہ ہر آدمی کی قسمت کا ایک ستارہ ہوتا ہے اور اس کے اس شخص کی زندگی پر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔''

''ہاں، میری قسمت کا ستارہ تو ہے۔'' اس نے ذو معنی انداز میں کہا۔

وہ خاموش رہی۔

ماحول کے سحر نے ویلی کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔

''اف! ستارے کتنے خوبصورت، کتنے چمکدار اور کتنے قریب ہیں۔ لگتا ہے ہاتھ بڑھا کر انہیں چھوا جا سکتا ہے۔''

لمبی خاموشی کے بعد آہو نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

''ہاں، بہت قریب...... چھوا تو جا سکتا ہے۔'' ویلی کی آواز جذبات سے بوجھل تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''ہم انسان بھی کتنے حریص ہوتے ہیں۔ خوبصورتی کو صرف دیکھنے کی مسرت ہی

کافی نہیں ہوتی کیا.......ہم ہر چیز کو اپنی ملکیت کیوں بنانا چاہتے ہیں؟''

''کہتی تو تم ٹھیک ہو۔''

ماحول کا سحر ٹوٹ چکا تھا۔ وہ دونوں بغیر کچھ کہے سنے کار کی طرف چل دیئے۔

ویلی کا تھیسس منظور ہو چکا تھا اور اسے اپنے ملک سے بہت اچھی جاب کی آفر آ چکی تھی۔ اس نے آہو کو بتایا۔

''سو تم دیوتاؤں کی سرزمین کو واپس جا رہے ہو۔''

''ہاں...... اور سوچ رہا ہوں، یہ دیوی یہاں کیا کر رہی ہے، اسے بھی وہیں ہونا چاہیے۔''

وہ ہنسنے لگی۔

''میرا جانے کو دل نہیں چاہ رہا۔''

''میرا تو خیال ہے خوش نصیبی بار بار آپ کے در پر دستک نہیں دیتی۔''

اسے اس کا جواب مل چکا تھا۔ سو اس نے پیک اپ کر لیا۔

روانگی کے وقت وہ سچ مچ اداس ہو گئی۔ ''میں تمہیں بہت مس کروں گی ویلی، مجھے زندگی میں پہلی بار ایک صحیح معنوں میں اچھا دوست ملا تھا۔''

''تو میں نہیں جاتا۔''

''ارے تم، اتنی اچھی آفر کیسے رد کر سکتے ہو۔''

''کچھ چیزیں اتنی قیمتی ہوتی ہیں کہ ان کے لیے کچھ بھی چھوڑا جا سکتا ہے۔''

''چلو اب جاؤ، لاسٹ کال ہے۔''

اور وہ چپ چاپ چلا آیا۔ لیکن نہ اسے اس پر غصہ آیا اور نہ اس کی محبت میں کمی واقع ہوئی۔ اس کی اپنی بے اختیاری نے اسے سمجھا دیا تھا کہ جس طرح وہ آہو کو اپنے دل سے نکالنے پر قادر نہیں ہے اسی طرح آہو بھی اس کی محبت کی شمع اپنے دل میں روشن پر اختیار نہیں رکھتی۔

اس نے جدائی کے عذاب کی تلخی چکھی۔ وہ کیفیت بہت ہی عجیب بہت مختلف تھی۔ آہو کا تصور ذہن میں آتے ہی ایک درد اس کی رگ رگ میں پھیل جاتا۔ یوں جیسے نس نس سے

روح کھینچ کر نکالی جا رہی ہو۔ عجیب جاں گسل کیفیت ہوتی، اس کے باوجود اس کیفیت میں ڈوبے رہنے اور کبھی نہ نکلنے کو جی چاہتا۔ پھر یہ درد رگ رگ سے کھچ کھچ کر اس کے دل میں سما جاتا اور دل اس کی حدت سے پگھل کر آنکھوں سے بہنے لگتا۔ اس کے آنسو بہتے رہتے اور وہ بے دم سے پڑا رہتا۔ اس نے ہر لمحہ مرنے کی اذیت اٹھائی اور پھر زندہ رہنے کے کرب کو جھیلا۔ رفتہ رفتہ وہ کرب واذیت اس کے وجود میں گھل گئی، اس کی ذات کا حصہ بن گئی۔ ذہن نے آہو کی کئی خوبصورت اور متحرک تصویریں زندہ کر کے آنکھوں کی پیاس بجھا دی۔ اب آہو کو دیکھنے کے لیے اسے نہ روشنی کی ضرورت تھی نہ بصارت کی۔ وہ آنکھوں کو بند کر کے محو نظارہ رہتا، ای میل سے رابطہ رہتا...... خیریت معلوم ہو جاتی۔

ایک بار اس نے لکھا۔ ''کیا تم ابھی تک کیوپڈ کے نشانے کی زد پر نہیں آئے؟ کیا سائیکی ابھی تک تمہیں ڈھونڈ نہیں پائی۔ ویسے تم اب زندگی میں اچھی طرح سیٹل ہو۔ اب یہ کام بھی کر ہی ڈالو۔ میری منگنی ہو گئی ہے۔ اور اگلے مہینے میری شادی ہو رہی ہے۔ اسے ہمارے ہاں چٹ منگنی پٹ بیاہ کہتے ہیں۔ میرے والدین نے اسے میرے لیے پسند کیا ہے اور مجھے ان کی پسند پر اعتبار ہے۔''

اگرچہ یہ متوقع تھا مگر اسے اس بات کا دکھ تھا کہ وہ شادی صرف ایک معاشرتی تقاضے کے طور پر کر رہی ہے۔ محبت کی خاطر نہیں۔

اس نے اپنی شادی کا کارڈ بھیج کر اسے آنے پر اصرار کیا۔

وہ حقائق کو چاہے کتنا بھی سمجھ لے، دل کتنا ہی بڑا کر لے۔ مگر اس کو یوں اپنے سب سے خوبصورت روپ میں اپنی نظروں کے سامنے کسی اور کے ساتھ رخصت ہوتے۔ دیکھنا اس کی برداشت سے باہر تھا۔

وہ اپنے دکھے دل کی گہرائیوں سے اس کی خوشیوں کے لیے دعائیں کرتا رہا۔

کئی مہینے گزر گئے۔ پھر ایک دن اس کی میل آئی، لکھا تھا۔ ''دوست تمہارے سوا میں کسی کو نہیں بتا سکتی۔ میرا شوہر خود غرض، خود پسند اور سنگدل شخص ہے۔ وہ میری تحقیر و تذلیل کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ وہ نفسیاتی مریض ہے، اس کے موڈ اتنے اچانک اور تیزی سے بدلتے ہیں کہ میں خوفزدہ ہو جاتی ہوں۔ مجھ میں اسے کچھ بھی کہنے کی ہمت نہیں ہوتی

کیونکہ پھر وہ مشتعل ہو جاتا ہے اور مجھ پر ہاتھ اٹھانے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ میں نے اپنے والدین کو کچھ نہیں بتایا کہ وہ اتنی دور وطن میں بیٹھے ہیں، انہیں دکھ ہوگا۔"

میل پڑھ کر اس کا خون کھول اٹھا۔ وہ طبعاً نرم خو اور معاملہ فہم تھا۔ مگر اس کا دل چاہا کہ وہ اس کمینے کو تڑپا تڑپا کر مار ڈالے جو آہو کی اتنی تذلیل کرتا ہے، اتنی معصوم اتنی نازک سی لڑکی پر ہاتھ اٹھاتا ہے۔ اسے اس کے والدین پر بھی بہت غصہ آیا، جو بغیر کسی تحقیق و تفتیش کے یوں اندھا جوا کھیل کر دور جا بیٹھے۔ حد تو یہ ہے کہ آہو کو اب بھی ان کے دکھی ہونے کی فکر ہے ان سے کوئی شکایت نہیں۔ "عجیب ہے یہ لڑکی بھی۔" اسے پہلی بار آہو پر غصہ آیا۔ اس نے اسے لکھا۔

"تمہارے والدین دور ہیں تو کیا ہوا تم تنہا نہیں ہو۔ میں صرف ایک ٹیلیفون کال کے فاصلے پر ہوں۔ تم بیٹھی کیا دیکھ رہی ہو۔ تمہیں اس کی فطرت جان لینے کے بعد اس سے بہتری کی کون سی توقع ہے۔ تم زندگی بھر یہ عذاب کیوں جھیلو۔ فوراً علیحدگی اختیار کرلو۔"

اس نے جواب دیا۔ "تمہیں اندازہ نہیں ہے ہمارے کلچر میں طلاق کو کتنا برا سمجھا جاتا ہے اور ہمارے خاندان میں سات پشتوں میں ایسا کبھی نہیں ہوا۔"

وہ اسے مسلسل سمجھاتا اور ہمت دلاتا رہا کہ وہ پڑھی لکھی ہے، بالغ ہے، خود مختار ہے، وہ اپنے فیصلے خود کرسکتی ہے۔ محض کلچر پر خود کو قربان کر کے اتنی ذلت، اتنا دکھ جھیلنا پاگل پن ہے، خود پر ظلم ہے اور وہ اسے یہ ظلم نہیں کرنے دے گا۔

اور آخر جب بات آہو کی برداشت سے باہر ہوگئی تو اس نے لکھا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو، میں نے علیحدگی کا فیصلہ کرلیا ہے۔ میں واپس اپنے گھر آرہی ہوں۔"

کاسو بھی فوراً چھٹی لے کر پہنچ گیا۔ اس کی حالت دیکھ کر اس کا دل کٹ کر رہ گیا۔ زرد رنگ، آنکھوں کے گرد گہرے حلقے اور ایک آنکھ کے گرد گہرا نیل اس کے شوہر کی بربریت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ وہ تو اس طرح تھی کہ جیسے پتھر کی ہوگئی تھی۔ نہ روتی، نہ ہنستی، نہ مسکراتی...... جذبات سے عاری چہرہ لیے خاموش بیٹھی رہتی۔ باہم صلاح مشورے سے وکیل کے ذریعے عدالت میں طلاق کا مقدمہ فائل کر کے اور اسے ہمت و حوصلہ دے کر وہ چلا آیا۔

وہ کئی بار دودلی ہو جاتی۔ "کیس واپس نہ لے لوں وکیلی، ایک کوشش اور نہ کر دیکھوں۔"

لیکن وہ اسے اس فیصلے پر قائم رہنے کی تاکید کرتا رہا۔

آخرکار چھ مہینے بعد اسے طلاق مل گئی کہ فریق ثانی ایک بار بھی کورٹ نہ آیا۔ اسے قانون کی بالادستی اور اپنے اعمال کا پتہ تھا۔

وہ بری طرح ٹوٹی ہوئی تھی۔ اور یہ وہ وقت تھا کہ وہ اس طرح اس کی دسترس میں تھی جیسے پکا ہوا پھل، جسے ہاتھ بڑھا کر شاخ سے توڑ لیا جائے۔

اس نے لکھا تھا۔ ''آج میرے ذہن سے بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا ہے۔ مگر یہ تلخ تجربہ مجھ سے زندگی کی امنگ اور خوشی بھی چھین کر لے گیا ہے۔ تم نے جس طرح میرے درد کو سمجھا ہے اور میری مدد کی ہے، میں اس احسان کا بدلہ کبھی نہیں چکا سکتی۔ تم ہمیشہ ہر قدم ہر مرحلے پر میرے ساتھ رہے ہو۔ میں تمہارے جذبات سے آگاہ ہوں اور تمہاری ہونے کو تیار ہوں۔''

وہ جانتا تھا...... وہ اس کی عزت کرتی تھی، اس کی احسان مند تھی اور اسی لیے اس کی ہونے کو تیار تھی مگر اس کے دل میں اب بھی وہ شمع روشن نہیں ہوئی تھی جس نے اس کی روح کے گوشے گوشے کو اجال دیا تھا۔ اس نے جواب دیا۔ ''گھبراؤ نہیں، وقت کا مرہم رفتہ رفتہ تمہارے زخموں کو مندمل کر دے گا اور تمہاری زندگی معمول پر آ جائے گی۔ میں نے جو کچھ کیا اپنی خوشی کے لیے کیا ہے اس میں احسان کہاں سے آ گیا۔ تم اپنے ذہن پر کوئی بوجھ نہ لو۔ خود کو وقت دو اور پھر جو فیصلہ تمہارا دل کرے، اس پر عمل کرو۔''

کاسمو پوچھتا ہے۔ ''کیا تمہیں پچھتاوا نہیں کہ تم نے وہ موقع کھو دیا۔''

وہ اسے کیسے سمجھائے اور اس کی سمجھ میں آئے گا بھی کب کہ آہو کسی درخت کی شاخ پر لگا ہوا کوئی پھل نہیں، ایک جیتی جاگتی دل و دماغ رکھنے والی لڑکی تھی۔ اور وہ بخوبی جان چکا تھا کہ وہ اس کے دماغ تک تو پہنچ گیا تھا مگر دل تک رسائی نہ پا سکا تھا۔ اور عشق میں جسموں کا ملاپ اضافی ہے جب تک دونوں قالبوں میں ایک ہی دل نہ دھڑکے۔

یقیناً آہو کے دل میں اس کے لیے ایک خاص مقام تھا۔ ایک سچے اور مخلص دوست کا مقام۔ وہ اس پر بھروسہ کرتی ہے۔ اپنی خوشیاں اور غم اس کے ساتھ بانٹتی تھی۔ اس کے دکھ سکھ کی بھی خبر رکھتی تھی۔ مگر محبت کی جن بلندیوں سے وہ اس کی ذات کے حوالے سے آشنا ہوا تھا وہ اس کا اندازہ کرنے سے قاصر تھی۔

پھر رفتہ رفتہ وہ نارمل ہوتی گئی اور اس کی میلز کے وقفے طویل ہوتے گئے۔

پھر ایک طویل عرصے بعد ایک خوبصورت کارڈ نے اس کی شادی کی خبر دی۔ اس کے دل میں اندیشے سر سرانے لگے۔ کیا اس بار بھی وہ آنکھیں بند کر کے والدین کے فیصلے پر عمل کر رہی ہے۔ اتنے بڑے سانحے کے بعد اسے خود خبردار رہنا چاہیے۔ جس سے شادی کر رہی ہے اس کے متعلق جاننے بلکہ اسے جاننے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اس نے اپنے خدشات کا اظہار مبارکباد کی میل میں کیا۔ اس کا جواب آیا۔ ''فکر نہ کرو، یہ میرا اپنا انتخاب ہے۔''

اس نے اس کی تصویر بھی بھیجی۔ وہ بہت وجیہہ وشکیل تھا۔ بالکل کوئی یونانی دیوتا لگ رہا تھا۔ اس نے جواباً اسے لکھا۔ ''تم ایک یونانی دکھائی دینے والے پاکستانی سے شادی کر رہی ہو۔ میں سوچ رہا ہوں کہ کیوں نہ میں بھی کسی پاکستانی دکھائی دینے والی یونانی لڑکی سے شادی کرلوں۔''

اس کے دماغ نے اسے کئی بار مشورہ دیا کہ وہ بھی زندگی کی ضرورت سمجھ کر اپنا گھر بسا لے۔ وہ اس ارادے سے کچھ لڑکیوں سے ملا بھی مگر دل کسی کو شریک زندگی بنانے پر آمادہ نہ ہوا۔ اور اس نے دل کے آگے ہار مان لی۔ وہ جان گیا ہے کہ اس کا وجود فقط آہو کی محبت کا مسکن ہے اور وہ اسے زندگی کی آخری سانس تک چاہتا رہے گا۔

ہاں، اسے آہو سے عشق ہے مگر یہ عشق لوگ داستان نہیں بن پائے گا کیونکہ لوک داستان بننے کا اعزاز صرف ان قصوں کو ملتا ہے جن میں آگ دونوں طرف برابر لگی ہوئی ہو۔ ورنہ شمع پر تو کتنے ہی بے نام پروانے جل مرتے ہیں۔

وصل اور جدائی اضافی چیز ہے، اصل بات تو ایک دوسرے کے دل میں ایک ہی شدت سے دھڑکنے کی ہے۔

اماں شیراں

کالی اوڑھنی، پھولدار کرتے اور گہرے نیلے تہمد میں ملبوس دہرے بدن کی ڈھلتی عمر کی وہ خاتون بڑی متوازن رفتار سے راہداری میں سے چلتی ہوئی آ رہی تھی۔ میں بیرونی گیٹ کے کٹاؤ میں سے اسے آتا دیکھ کر سوچ رہی تھی کہ اس عورت کے لباس میں تینوں کپڑے مختلف رنگ کے ہونے کے باوجود عجیب نہیں لگ رہے کیونکہ پہننے والی کی چال ڈھال اور انداز میں ایک خاص رکھ رکھاؤ اور وقار ہے۔

میری نند سلیقہ کا سسرال دیہات سے ہے۔ میں سمجھ گئی کہ یہ انہی میں سے کوئی ہوگی۔ میں نے بڑے تپاک سے مودب ہو کر سلام کرتے ہوئے اس سے ہاتھ ملایا۔ اس نے ہاتھ تو ملا لیا مگر ایک لاتعلقی سے سلام کا جواب دیتے ہوئے میرے آگے آگے چلتی ہوئی عقبی صحن کی طرف چلی گئی۔ مجھے اس کا رویہ کچھ عجیب لگا۔ میں اندر داخل ہوئی تو فوراً ہی مارے تجسس کے سلیقہ سے پوچھا۔

''وہ جس نے گیٹ کھولا تھا، وہ کون تھی؟''

''اماں شیراں'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

''تمہاری سسرال میں سے ہے نا؟''

''نہیں''

''پھر......؟''

''گھر کے کام میں مدد کے لیے رکھی ہے۔''

''اچھا...... اچھا'' مجھے حیرت ہوئی۔ ''ویسے ہے بڑے رعب داب والی، کام کرنے والی بالکل نہیں لگتی۔ میں نے تو بڑی عزت بلکہ عاجزی سے اسے سلام کیا ہے۔''

''وہ ہے بھی ایسی ہی۔''

پھر چائے کے دوران اس نے مجھے اس کی پوری کہانی سنائی کہ......

وہ ننکانہ صاحب کے قریب ہی ایک گاؤں میں رہتی ہے۔ تھوڑی سی زمین اور دو چار ڈھور ڈنگروں کے ساتھ چار بیٹے اور بیٹیاں تنگی ترشی سے پل کر جوان بھی ہو گئے اور اپنے اپنے گھروں کے بھی ہو گئے، سوائے سب سے چھوٹی بیٹی کے جس کی شادی کی بات چل رہی تھی۔ میاں اس کی شادی بیٹی سے دگنی سے بھی کچھ زیادہ عمر کے نکھٹو بھتیجے سے کرنا چاہتا تھا اور اماں شیراں اسے جانتے بوجھتے ہوئے کنوئیں میں پھینکنے پر تیار نہ تھی۔ جبکہ اس کے جوڑ کا اچھا رشتہ بھی موجود تھا۔ اختلاف بڑھتا رہا۔ اور ایک دن اسی جھگڑے میں بات کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی۔ شیراں کے میاں نے اسے دھکا دیتے ہوئے کہا۔ ''نکل جا میرے گھر سے۔''

''تمہارے گھر سے نکل جاؤں؟'' اماں شیراں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

''ہاں، ہاں...... میرے گھر سے نکل جاؤ۔'' اس نے اسی لہجے میں کہا۔

یہ بات شیراں کے دل میں تیر کی طرح جا لگی اور اسے ایسا گہرا گھاؤ لگا گئی کہ وہ تڑپ اٹھی...... تو کیا یہ گھر اس کا نہیں ہے...... وہ گھر جس کے لیے اس نے اپنا خون پسینہ ایک کیا۔ کچی عمر کی الہڑ جوانی سے محنت مشقت کرتے ہوئے اپنا آپ بھلا دیا۔ یہاں تک کہ ادھیڑ عمری کی دہلیز پر آ پہنچی۔ اور پھر اسے گوارہ نہ ہوا کہ جس گھر کو وہ صرف اپنا گھر سمجھتا ہے، بے عزتی کے ساتھ رہے۔

شیراں نے کپڑوں کا جوڑا تک نہ اٹھایا۔ پلے تھا ہی کیا۔ پیسہ پیسہ جوڑ کر کرائے کا بندوبست کیا اور اسی وقت گھر سے نکل کھڑی ہوئی، بغیر یہ سوچے کہ اس کا کوئی اور ٹھکانہ تو ہے نہیں...... کہاں جائے گی۔

اس کی برادری کی ایک عورت لاہور میں کسی کے گھر میں کام کرتی تھی۔ شیراں نے

سوچا، وہ بھی کسی گھر میں کام کرے گی۔ بس کا ٹکٹ خریدا اور لاہور آ پہنچی۔ بس جہاں رکی، وہاں سے پیدل چلنا شروع کر دیا اور رہائشی آبادی میں جو پہلا گھر نظر آیا اس کی گھنٹی بجا دی۔ یہ اور بات ہے کہ وہ ایک در بند ہونے پر سو در کھولنے والا اس کے بھٹکنے سے بچنے کا انتظام کیے بیٹھا تھا۔ اتنی امید تو خود شیراں کو بھی نہیں تھی کہ وہ گھر سے نکل کر سیدھی یوں یہاں آ پہنچے گی جیسے وہ اسی گھر میں آنے کے لیے بس میں سوار ہوئی تھی۔

سلیقہ بھی اپنی طرح کی ایک ہی ہے۔ آج کل کے زمانے میں کوئی بھی بغیر کسی جان پہچان اور حوالے کے کسی کو دہلیز پر قدم نہیں رکھنے دیتا۔ مگر یہ دل کے ہاتھوں مجبور ہر ایک کے کام آنے کی دھن میں فوراً ہی ہر خطرہ مول لینے کو تیار ہو جاتی ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ بے خطر ہر ایک کی آگ میں کود پڑتی ہے۔ کئی بار دھوکہ بھی کھایا، نقصان بھی اٹھایا۔ مگر اپنی روش نہ بدلی۔ ایک تو شیراں کی شخصیت، دوسرے خود سلیقہ کا مزاج اور پھر ضرورت...... سو بڑی سہولت سے معاملات طے پا گئے اور شیراں "اماں شیراں" بن کر ان کی گرہستی میں داخل ہو گئیں۔

سلیقہ نے بتایا کہ اسے تو گھر بیٹھے نعمت مل گئی ہے۔ اماں شیراں اپنے کام سے کام رکھتی ہے۔ فارغ ہو تو پچھلے برآمدے میں بیٹھی رہتی ہے۔ رات کو بھی وہیں سوتی ہے، کبھی اندر لاؤنج میں ٹی وی وغیرہ دیکھنے کو نہیں آ بیٹھتی۔ کبھی اپنے ہاتھ سے اٹھا کر نہیں کھایا پیا، جو دے دیا کھا لیتی ہے، لالچ بالکل نہیں ہے۔ نہ ہی کچھ مانگنے کی عادت ہے۔ ایک جوڑے میں آئی تھی، میں نے دو جوڑے بنوا دیے ہیں تو بہت منع کرتی رہی کہ ایک ہی بہت ہے۔

"بھئی ایسی رعب داب والی معزز عورت کو کام بتانے کی میری تو ہمت نہ پڑے۔"

"پڑتی تو میری بھی نہ، مگر بتانا ہی نہیں پڑتا، خود سے کر دیتی ہے۔ بڑی محنتی اور مخلص ہے۔"

میں اماں شیراں کی شخصیت سے بہت متاثر ہوئی۔ اس کے سامنے مجھے اپنا آپ بہت حقیر بہت چھوٹا لگا اور میں بے حد اداس ہو گئی۔

عائلی زندگی کے گزشتہ برسوں میں کئی بار ایسے مواقع آئے تھے جب میری انا کو زبردست ٹھیس پہنچی تھی۔ کیسا کیسا نہ دل چاہا تھا کہ اس گھر کو چھوڑ کر چلی جاؤں۔ جہاں میری

کوئی عزت نہیں مگر رو دھو کر خاموش ہو گئی۔ یہ سوچ کر خود کو تسلی دی کہ میں اس گھر کو جوڑے رکھنے کے لیے اولاد کے سکھ کے لیے یہ قربانی دے رہی ہوں۔ لیکن اماں شیراں کی کہانی سن کر مجھے اپنے دل میں اعتراف کرنا پڑا کہ گھر اور بچوں کے لیے قربانی کے علاوہ دور کہیں اندر سے علیحدگی کی صورت میں عملی زندگی کی مشکلات کا ڈر بھی ہوتا تھا۔ سو ڈھیٹ بن کر ٹال جاتی اور زندگی پھر معمول کے مطابق چل پڑتی۔

گھر پہنچ کر بھی میں بجھی بجھی سی رہی۔ یہ ہوتی ہے عزت نفس اور یہ ہوتا ہے اپنی ذات پر اعتماد اور خدا پر بھروسہ۔ میرے پاس تو ان تینوں میں سے ایک بھی نہیں۔ وہ تو مالا مال ہے، پر اعتماد مطمئن...... صحیح معنوں میں مفلس تو میں ہوں، نہ خود پر بھروسہ نہ خدا پر۔ آرام طلبی نے ڈھیٹ اور بے غیرت بنا دیا ہے۔ اب خود کو دھوکہ دینے کے لیے چاہے اس رویے کو کوئی بھی اچھا سا نام دیتی رہوں۔

اکثر یونہی ہوتا ہے جب کم ہمتی اور بزدلی آپ کے خوابوں کے صورت پذیر ہونے میں حائل ہو، ایسے میں اگر آپ وہ تمام خوبیاں کسی شخصیت میں دیکھ لیں جو آپ خود میں دیکھنا چاہتے ہیں تو پھر آپ اس کا بت بنا کر اپنے ذہن میں سجا لیتے ہیں۔ اماں شیراں بھی میری آئیڈیل بن گئیں۔

میرا جب بھی اپنی نند کے گھر جانا ہوتا، اماں شیراں سے بڑی محبت سے ملتی اور کرید کرید کر اس کی باتیں پوچھتی۔

سلیقہ نے بتایا کہ "میرے کام سے فراغت کے بعد اماں شیراں مقابل والے گھر کا بھی جھاڑو برتن کرنے لگی۔ میرے پاس پیسے جمع کر رہی ہے۔ ویسے اماں شیراں ہے ذرا عجیب۔"

پھر میرے استفسار پر سلیقہ کی زبانی بتائی ہوئی اماں شیراں کی کہانی سے اس کی شخصیت کا ایک اور پرت کھلا۔

شیراں اپنی چاروں بہوؤں میں سے ثریاں کو بہت عزیز رکھتی تھی۔ ثریاں تھی بھی بہت پیاری...... اونچا لانبا قد، گورا رنگ جو کھلی فضا اور دھوپ چھاؤں میں کام کرتے کرتے مدھم پڑ گیا تھا مگر اس سنہرے رنگ میں کھلتے گلاب جیسی سرخی میں وہ دلکشی تھی کہ نظر پلٹنا بھول جائے۔ موٹی موٹی (چیرویں) آنکھیں، ستواں ناک اور بھرے بھرے، ہونٹوں والے گلابی

دہانے کے اندر موتیوں کی طرح جڑے دانت اور سب سے بڑھ کر اس کے چہرے پر ایک عاجزی اور بھولپن تھا۔ صورت تو اس کی جو تھی، سو تھی مگر سب سے بڑھ کر اس کی عادات اور اخلاق تھا۔ پتہ نہیں کس دنیا سے تھی وہ۔ ساس کی، سسر کی، نندوں کی، دیورانیوں کی، پاس پڑوس کی، ہر ایک کی جی جان سے خدمت کر رہی ہے۔ دکھ سکھ میں کام آ رہی ہے۔ دوستی دشمنی، بدلے مقابلے کا اس نے کبھی نہ سوچا۔ اسے دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ اگر انسان نیک نیتی سے کام کرنا چاہے تو کتنا کچھ کر سکتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں برکت تھی۔ اس کے وقت میں برکت تھی۔ ایسی لڑکی سے کوئی کیسے حسد کرتا، سبھی اسے بہت چاہتے اور رحمے کی قسمت پر رشک کرتے۔

تین چار سال اس کے ہاں بچہ نہ ہوا۔ دیہاتوں میں سال بھر بعد ہی لوگ دوسری شادی پر تیار ہو جاتے ہیں۔ عزیزوں رشتہ داروں نے ادھر اماں شیراں کو اکسایا، ادھر رحمے کو دوسری شادی کے مشورے دینے لگے۔ مگر اماں شیراں نے بڑی سختی سے یہ کہہ کر سب کا منہ بند کر دیا۔ ''بچی ہے ابھی، کون سی اس کی عمر نکلی جا رہی ہے اور جو بچہ نہ بھی ہوا تو کون سا رحمے کے مربعے ہیں یا ملیں فیکٹریاں کھڑی ہیں کہ وارث ضرور چاہیے۔ اولاد غریبوں کی تو خوشی ہی ہوتی ہے، وہ ویسے ہی آپس میں خوش ہیں۔ اللہ نے چاہا اور قسمت میں ہوا تو اولاد بھی ہو جائے گی۔''

''کمال ہے کوئی ان پڑھ دیہاتی عورت ایسی اچھی سوچ رکھے۔ سچ ہے عقل و دانش خدا کی دین ہے ورنہ پڑھے لکھے جاہلوں سے تو دنیا بھری پڑی ہے۔'' اماں شیراں کا قد میری نظر میں اور بڑھ گیا۔

''ہاں، محبت بھی عجب اکسیر ہے۔ دلوں کو کیسا وسیع اور خالص بنا دیتی ہے۔ اماں شیراں کو بھی ثریاں سے محبت تھی نا۔'' سلیقہ نے اسے دوسرے زاویے سے سوچا۔

اور چار سال بعد ثریاں کی گود میں بیٹا تھا۔ اس سے اگلے سال بیٹی بھی پیدا ہو گئی۔ عادل اور عابدہ کے تین سال بعد پھر اگلے بچے کی ولادت میں جانے کیا گڑبڑ ہوئی کہ بچہ پیٹ کے اندر مر گیا۔ خدا جانے لڑکا تھا کہ لڑکی...... ثریاں کو ہسپتال لے جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ اس نے دم دے دیا۔

رحما جوان ہی تھا مگر اماں شیراں نے اس کی شادی نہ کی۔ کہتی ہے میں مرغی کے بچوں

میں بلی کیوں چھوڑنے دیتی۔ سوتیلی ماں، باپ کو بھی سوتیلا کر دیتی ہے۔ اپنے عادی اور عابو کی ماں میں ہوں اور باپ صرف انہی کا باپ رہے گا۔ پوتے کو پڑھا رہی ہے۔ کہتی ہے۔ '' کچھ ہی برسوں کی بات ہے، عادل جوان ہو جائے گا تو بہو خود ہی آ کر گھر سنبھال لے گی۔''

'' حد نہیں کرتی اماں شیراں بھی۔''

'' ہاں، محبتوں میں اسی طرح حد سے گزرنے کا ظرف بھی کسی کسی کا ہوتا ہے۔''

'' اب یہاں اسے انہی کی فکر کھائے رہتی ہے، کہتی ہے۔'' باجی! عابو کو اپنے پاس رکھ لیں۔ کھانا میں خود پکاتی ہوں، اوپر کے کام کے لیے وہ خود موجود ہے۔ میں نے کیا کرنا ہے عابو کو...... کہتی ہے۔'' آپ اسے تنخواہ وغیرہ کچھ نہ دیں، اچھا کھائے پیئے گی تو جلدی بڑی ہو جائے گی اور میں اس کی شادی کر دوں گی۔ میری زندگی کا کیا بھروسہ۔ میری عابو بڑی ہشیار ہے، اسے کھانا پکانا سکھا دینا، آپ کی مدد کرے گی۔'' میں تو چپ رہی بھلا نو دس سال کی بچی کیا کھانا پکانا کرے گی۔''

'' بلا لو عابو کو، میں رکھ لوں گی۔'' میں نے اماں شیراں کی عقیدت میں کہہ دیا۔

'' آپ کیا کریں گی، آپ کے پاس تو پہلے ہی کئی ملازم ہیں۔''

'' چلو میرے ذاتی چھوٹے موٹے کام کر دے گی۔''

پھر عابو بھی آ ہی گئی۔ ایسی پیاری صورت کہ نظر نہ ہٹے۔'' ماں پر گئی ہو گی۔'' میں نے ثریاں کی تعریفیں سن رکھی تھیں۔

'' ماں تو اس سے بھی خوبصورت تھی۔'' اماں شیراں بول اٹھیں۔'' اس کی آنکھیں رہتے پر چلی گئی ہیں۔ ثریاں کی تو ایسی کھلی کھلی آنکھیں تھیں کہ اس کی تو ایک آنکھ میں پورا آدمی سما جائے۔''

اس انوکھی تعریف پر مجھے ہنسی روکنا مشکل ہو گئی۔

اماں شیراں کو آئے ہوئے تقریباً ایک سال ہو چلا تھا۔ شروع شروع میں تو اس کے بیٹے بیٹیاں ملنے آتے اور اُسے واپس گھر چلنے پر اصرار کرتے رہے مگر اماں نہ مانی تو انہوں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ یوں بھی اسے اچھی طرح رہتے دیکھ کر انہیں اطمینان ہو گیا۔

عابو میرے پاس خوش تھی۔ میں نے اسے پڑھانا بھی شروع کر دیا تھا اور بول چال اٹھنے

بیٹھنے کی تمیز بھی سکھاتی رہی۔ وہ ہر چیز بڑی خوشی سے سیکھتی۔ مگر صرف چھ مہینے بعد ہی میرے میاں کی تین سال کے لیے ترکی میں پوسٹنگ ہوگئی اور میں عابو کو واپس کر کے چلی گئی۔

بیچ میں سے ایک ہفتے کے لیے اپنی چھوٹی بہن کی شادی پر آئی تو پتہ چلا کہ اماں شیراں کا میاں فوت ہو گیا ہے مگر اماں شیراں تب بھی نہ گئی، بولی۔ ''میرے لیے تو وہ اسی دن مر گیا تھا جس دن میں نے اس کا گھر چھوڑا تھا۔''

''توبہ! کیسا پتھر دل ہے اس عورت کا۔'' پتہ نہیں کیوں مجھے اچھا نہ لگا۔

تین سال بعد لوٹی تو گرہستی نئے سرے سے شروع کرنی پڑی۔ صفائی وغیرہ کا بھی بہت کام تھا۔ میں نے ایمپلائمنٹ ایکسچینج یعنی اپنی نند کی طرف رجوع کیا۔ اس کے گھر پہنچی تو دیکھا ٹی وی لاؤنج میں کھلتی رنگت اور سنہرے، بھورے بالوں والی دس گیارہ برس کی لڑکی نارنجی رنگ کا قیمتی سوٹ پہنے اور اس کی ہم رنگ لپ اسٹک لگائے جھاڑو لگا رہی تھی۔ لڑکی کی آنکھیں مبالغے کی حد تک لمبی تھیں اور گول مٹول چہرے پر بڑی معصومیت تھی۔

''کون ہے؟'' میں نے آنکھ کے اشارے سے سلیقہ سے پوچھا۔

''اماں شیراں کی پوتی ہے۔'' سلیقہ مختصر سا جواب دے کر چائے وغیرہ کا انتظام کرنے کچن میں چلی گئی۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' میں نے لڑکی سے پوچھا۔

لڑکی نے مسکرا کر کندھے اچکائے۔ ''مجھے نہیں آتا۔''

''کیا مطلب...... تمہیں اپنا نام نہیں آتا؟''

''ہاں جی'' اس نے اسی لاپروائی سے جواب دیا اور اپنے کام میں مگن رہی۔

''اچھا، یہ بتاؤ تم نے لپ اسٹک کیوں لگائی ہے...... بچے لپ اسٹک نہیں لگاتے۔''

''میری باجی نے مجھے دی ہے، اس لیے۔''

''کون سی باجی؟''

''میری باجی، جس کے پاس میں کام کرتی ہوں...... یہ ساتھ والے گھر میں۔''

اتنے میں سلیقہ آ گئی۔ میں نے ہنس کر اسے بتایا۔ ''یہ لڑکی کہتی ہے اسے اپنا نام نہیں

''ٹھیک کہہ رہی ہے۔ یہ لوگ بڑے شوق سے مشکل مشکل نام رکھ لیتے ہیں پھر انہیں صحیح طرح ادا نہیں کر پاتے۔ اس کی دادی سے پوچھو تو وہ اس کا نام گفتان بتاتی ہے۔ ویسے سب اسے گھو کہتے ہیں اور دراصل اس کا نام شگفتہ ہے۔''

تب تک گھو جھاڑ و لگا چکی تھی، اس لیے وہ باہر چلی گئی۔

''مجھے لگتا ہے یہ کہیں پیچھے سے شاہی خاندان سے ہیں، آنکھیں دیکھی تھیں اس کی۔''

''ہو بھی سکتا ہے، شکار کرتے ہوئے بھٹک کر گاؤں کی طرف آ نکلنے والے کسی بادشاہ، شہزادے کی نظر عنایت کے طفیل۔'' اور وہ کھل کر ہنس دی۔

اماں شیراں کو سمجھاؤ ایسی صورت والی الہڑ اور نادان بچی کو کسی کے گھر نہیں چھوڑنا چاہیے۔ تم نے سنے نہیں سینکڑوں واقعات...... کیا ہوتا ہے ان کے ساتھ۔''

''ٹھیک ہے، میں کیا سمجھاؤں، بچی نہیں ہے اماں شیراں...... جہاندیدہ عورت ہے۔ تم چائے تو پیو۔''

مجھے لگا اسے میری اماں شیراں اور اس کے معاملات میں اتنی دلچسپی اچھی نہیں لگی۔ میں پوری توجہ سے چائے پینے لگی۔

اماں شیراں برتن اٹھانے آئی، وہ مجھے بہت بدلی بدلی لگی۔ چہرے کے ٹھہراؤ میں اب ایک تختی سی شامل ہو گئی تھی۔ اس کے بدن کی حرکات و سکنات میں سستی مگر چندھی چندھی آنکھوں میں ایک پر تجسس تیزی تھی۔ بڑھتی عمر نے اماں شیراں کی شخصیت کا وقار چھین لیا تھا۔

''اماں شیراں بیچاری بڑی تیزی سے ڈھل رہی ہے۔'' میں نے افسوس کا اظہار کیا۔

اور اس کے گن گاتی نہ تھکنے والی سلیقہ نے خلاف توقع بڑی بیزاری سے کہا۔'' کئی بار کہا ہے کہ اماں اب تمہاری صحت اچھی نہیں، بہت کام کر لیا اب گھر جاؤ، آرام کرو...... مگر ان سنا کر کے پھرتی رہتی ہے۔ اب میں اٹھا کر پھینکنے سے تو رہی۔''

''ایسی کیا بات ہو گئی ہے؟''

''اماں شیراں نے پورے شہر میں اپنی نواسیاں، پوتیاں پھیلا دی ہیں، دس دس گیارہ برس کی بچیاں...... مگر عمر کہیں رکی رہتی ہے۔ آسودگی کا کھانا پینا ملنے پر وہ ہاتھ پیر نکالے ہیں کہ پوچھو مت۔ صورتیں تو ان کی اچھی ہیں ہی، شہر کی ہوا خوب لگی ہے۔ ہر طرف سے شکایتیں آ

رہی ہیں۔ مگر اماں شیراں کان لپیٹے بیٹھی ہیں۔ مصیبت مارے سب کے فون میرے گھر آتے ہیں۔ میں کہتی بھی ہوں کہ میری کوئی ذمہ داری نہیں، مگر اماں شیراں کی وجہ سے بات کرنی پڑتی ہے۔ کئی بار بیگمات خود چلی آتی ہیں۔ بڑی کوفت ہوتی ہے۔ میاں الگ ناراض ہوتے ہیں کہ سارا دن گھر میں اماں شیراں کی پوتیوں، نواسیوں کی نظر بازیوں کے قصے چلتے رہتے ہیں، بچوں پر برا اثر پڑے گا۔''

میں حیران یہ سب سنتی رہی۔ اتنے میں فون آ گیا۔

سلیقہ نے رسمی سلام دعا کے بعد کہا۔'' شکر ہے، میں نے تو آپ کو پہلے ہی کہہ دیا تھا، میری کوئی ذمہ داری نہیں...... آپ جانیں اور اماں شیراں جانے......لو ان سے بات کر لیں۔'' اس نے کورڈلیس فون برآمدے میں جا کر اماں کو پکڑا دیا۔

''توبہ، آخر آئی ہوئی ہے اس فری کم بخت کو۔''

''کون فری؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی میرے منہ سے نکل گیا۔

''اماں کی نواسی...... مسز بھٹی کہہ رہی تھیں اس کی ماں کو کہو اسے لے جائے، مجھے نہیں اسے رکھنا۔ مجھ سے نہیں اس کے پہرے دیئے جاتے۔ آفت مچا رکھی ہے اس نے۔''

''اچھا، میں چلتی ہوں پھر ذرا کوئی انتظام کرنا کسی صفائی والی کا۔'' اس کی بگڑا ہوا موڈ دیکھ کر میں نے جانے کی ٹھانی۔

''فی الحال تم اماں کو لے جاؤ، کل آ جائے گی تمہاری ملازمہ۔''

اتنے میں اماں فون واپس کرنے آ گئیں اور سلیقہ سے بولی۔'' پتر ذرا گفورے دا میل ملا دے، اوہنوں کہنا اے بیدی نوں گھل دیوے، آ کے فری نوں لے جاوے، بیگم نہیں رکھدی اوہنوں۔''

سلیقہ پہلے ہی غصہ دبائے بیٹھی تھی، اماں کی اس فرمائش پر اس کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ اماں نمبر کی پرچی ہاتھ میں لیے کھڑی تھی۔ میں نے پرچی اماں کے ہاتھ سے لے کر کہا۔

''چلو میری طرف سے کر لینا۔''

اور میں اماں کو لے کر آ گئی۔

میں نے گھر جاتے ہی موبائل فون سے نمبر ملا کر اسے پکڑا دیا۔

''گفورے! کل سویرے بیدی نوں بھیج دے، اونوں کہیں سیما نوں نال لے آوے..... اتھے میں وعدہ کیتا ہویا اے کے نال۔''

''ہاں، بس او پرا کم۔''

''آہو، لاگے ای اے۔''

''ہجار رپیا تنکھا اے۔''

''بس کل ای بھیج دے۔''

میں حیران تھی، اس نے فری کا ذکر تک نہ کیا۔

میں نے اماں سے کچن کی صفائی کرنے کو کہا تا کہ کم از کم کھانے پکانے کا تو نظام صحیح چل جائے۔ کافی کام تھا۔ صفائی کر کے جب اماں جانے لگیں تو بولیں۔

''ذرا پتر، بیگم بھٹی کو تو فون ملا دو۔'' اس نے مجھے نمبر کی پرچی دیتے ہوئے کہا۔

میں نے فون ملا کر دے دیا۔

وہ اسے کہہ رہی تھی۔ ''میں نے فری کے ماں باپ سے بات کی ہے، وہ کہہ رہے ہیں کہ ہم نے فری کی شادی کے دن رکھ لیے ہیں، بس مہینے ڈیڑھ کی بات ہے پتر...... تین سال سے تیرے پاس رہ رہی ہے۔ اللہ تیرا بخت سلامت رکھے، اسے بیٹی کی طرح رخصت کر۔ بے شک سختی کرو، ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ اس کھوتی کو کہو، ذرا عقل مت کرے...... ڈیڑھ مہینے بعد تو اس کی شادی ہونے والی ہے۔ فکر نہ کرو پتر، میں کل آ کر اسے سمجھا جاؤں گی۔''

''اللہ تیرا بھلا کرے پتر، تیری مہربانی۔'' اس نے فون واپس کریڈل پر رکھ دیا۔

میں ایک صدمے کی کیفیت میں سن سی بیٹھی رہ گئی۔

میں نے اس کی چیل کی طرح چمکتی پرتجسس آنکھوں، لمبی ناک اور جھریوں بھرے سوکھے چہرے میں گم شدہ اپنی آئیڈیل، باوقار اماں شیراں کو ڈھونڈنے کی ناکام کوشش کی۔

وہ غیر متوازن قدموں سے چلتی ہوئی بیرونی دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی اور مجھے لگا میں اماں شیراں کو نہیں اس کے بھوت کو جاتے دیکھ رہی ہوں۔

وہ خط

میں نے جب آنکھ کھولی تو اُنہیں اپنے گھر میں موجود پایا۔ سو میرا گھر ان کا بھی گھر تھا۔ تب تو خیر میرا اُن کی صورت پر کبھی دھیان نہیں گیا تھا لیکن اب اُن کی شکل دھیان میں لاتی ہوں تو جیسے وہ سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں دراز قد، سڈول بدن، گوری رنگت، چھوٹی بھوری آنکھیں سنہرا پن لئے بھورے بال، ستواں ناک، فراخ پیشانی اور بھرے بھرے ہونٹ۔ یہ تھے بھائی جان آصف اس حلیے کے ساتھ ہوتا تو اُنہیں وجیہہ و شکیل چاہیے تھا۔ مگر اُن کی چال ڈھال اور نشست و برخاست میں دھیما پن اور چہرے پر عجز کا تاثر تھا جو بسا اوقات مسکینی سے جا ملتا تھا اُس کی وجہ سے وہ صرف ایک قبول صورت شخص لگتے۔ اُن کی آنکھوں میں بڑی نرمی اور شفقت تھی۔ آواز میں ٹھہراؤ کے باوجود ایک ملائمت تھی۔ وہ مجھے بے حد اچھے لگتے۔

تب مجھے اتنا شعور تو نہیں تھا کہ عمروں کا اندازہ کر پاتی۔ لیکن جب میں پانچ چھ برس کی تھی اور اُن کو اپنے ہر کھیل میں شریک ہونے پر اصرار کرتی۔ تب بھی وہ کوئی نوعمر لڑکے نہیں تھے پُورے مرد تھے۔ پچیس تیس برس کے تو ہو گئے ہی۔

میں شروع سے اپنے ہی مزاج کی لڑکی تھی۔ اپنے آپ میں مگن...... تجسس تو سرے سے تھا ہی نہیں کہ کچھ جاننے کی کوشش کرتی۔ سو میری ذہنی عمر میری جسمانی عمر سے بہت کم تھی اور تو کوئی مجھ بدھو کو منہ نہ لگاتا۔ بس بھائی جان کے سر ہوئی رہتی۔ ہر جگہ اُن کے ساتھ جانے پر

مصر۔ وہ کئی بار منع کر دیتے تو میں اُداس ہو کر چپ ہو جاتی۔ اور وہ پیار سے "پگلی" کہہ کر ساتھ لے لیتے اور میں خوش خوش اُن کے ساتھ چل پڑتی۔ امی نے میرے اس طرح دُم چھلا بنے رہنے پر نہ کبھی ٹوکا نہ سرزنش کی۔ پھر میں سکول جانے لگی۔ اب ہر وقت اُن کے ساتھ لگے رہنا تو چھوٹ گیا۔ مگر رات کو انہیں ضرور ڈیوٹی دینی پڑتی۔ سارے دن کی رُوداد کے علاوہ اُنہیں میری ٹیچروں اور سہیلیوں کے نام یاد رکھنا بھی ضروری تھے۔ پھر میں کہانیاں پڑھنے لگی تو مزید اضافہ یہ ہوا کہ میں جو بھی کہانی پڑھتی وہ ضرور بھائی جان کو سُناتی۔ وہ بڑے تحمل اور پوری توجہ سے سنتے۔ اکثر میں کہانی سُناتے سُناتے سو جاتی تو وہ مجھے اُٹھا کر میرے بستر پر لٹا دیتے۔

وہ واقعہ تو مجھے خوب یاد ہے۔ مجھے بخار تھا غالباً ملیریا...... امّاں مجھے کونین پلانا چاہ رہی تھیں کیونکہ گولی میں نگل ہی نہیں سکتی فوراً قے ہو جاتی۔ دو تین بار اُنہوں نے چمچ میرے مُنہ سے لگایا مگر میں ہر بار ان کا ہاتھ جھٹک دیتی۔ آخر ٹھنڈے مزاج کی امّاں تک کو غصہ آ گیا اور اُنہوں نے مجھے جما کے تھپڑ لگا دیا۔ بھائی جان پاس ہی کھڑے تھے بولے۔

"امّاں، کمال کرتی ہیں آپ...... ایک تو وہ بیمار ہے اُوپر سے آپ مار رہی ہیں۔ لائیے میں دوا پلا دیتا ہوں۔"

بھائی جان دوا لائے۔ "چلو شاباش پی لو...... دوا نہیں پیئے گی تو ٹھیک کیسے ہوگی...... پگلی" اور میں نے فوراً دوا پی۔

بھائی جان بھی تو میری کوئی بات نہیں ٹالتے تھے۔ ایک بار میں حسبِ معمول اُن کے ساتھ تھی کہ اُن کا کچھ دوستوں کے ساتھ فلم کا پروگرام بن گیا۔ اُنہوں نے چاہا کہ مجھے گھر چھوڑ دیں۔ مگر میں نے حسبِ عادت انکار کر دیا اور ساتھ جانے کی ضد کی۔

"تمہاری ٹکٹ نہیں ہے میرے پاس۔" اُنہوں نے سمجھانے کی کوشش کی۔

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے تو انہوں نے ہار مان لی مگر ٹکٹ واقعی اُن کے پاس نہیں تھی اور میں اُن کے اوور کوٹ کے اندر چھپ کر گیٹ کیپر کی نظر میں آئے بغیر اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو گئی۔ حالانکہ اندر میوزک کے تیز شور اور سکرین پر کلوز اَپ میں بڑے بڑے چہرے دیکھ کر ایسی ڈری کہ پہلے سین پہ جو آنکھیں بند کیں تو ختم ہونے پر کھولیں۔

ایک بار پھر کافی عرصے بعد مجھے بہت تیز بخار تھا۔ عجیب عجیب ڈراؤنے خواب آتے

اب میں نے ضد پکڑ لی کہ میں بھائی جان کے ساتھ سوؤں گی۔ اُس وقت میری عمر کوئی چودہ پندرہ برس رہی ہوگی۔

''سب اِسی کمرے میں سو رہے ہیں۔ ڈر کس بات کا...... میں آیۃ الکرسی پڑھ کر پھونک دیتا ہوں'' ''نہیں، میں آپ کے ساتھ سوؤں گی۔'' میں نے اِصرار کیا۔ حالانکہ امّاں پاس ہی بیٹھی تھیں۔ میں نے اُن کے ساتھ سونے کا سوچا تک نہیں۔ اوّل تو امّاں کافی سنجیدہ اور کم گو تھیں اور ویسے بھی بچوں سے ذرا فاصلہ ہی رکھتی تھیں۔ ماں تھیں ضرور پیار ہوگا۔ مگر اُنہوں نے اِسکا اظہار کبھی ضروری نہ سمجھا کوئی فرمائش اور ضد تو دُور کی بات ہے ہمیں تو ڈر ہی لگتا تھا اُن سے۔ سو میرا بھائی جان کے ساتھ سونے کا اصرار جاری رہا۔

آخر بھائی جان بولے۔'' دیکھو مُنی۔ میں تمہیں اپنے ساتھ سلاؤں گا تو مجھے بھی بخار ہو جائے گا۔ تو کیا تم چاہتی ہو کہ میں بھی بیمار ہو جاؤں۔ پھر دوائی کون لائے گا؟ تمہارا خیال کون رکھے گا؟

یہ بات میری سمجھ میں آ گئی۔''ٹھیک ہے، مگر جب مجھے ڈر لگے اور میں جاگوں تو میرے ساتھ جاگنا ہوگا۔''

''ہاں، ہاں، یہ پکی بات ہے۔'' پھر مجھے کمبل اُڑھاتے ہوئے بولے۔''پگلی'' اور جب تک میں سو نہیں گئی۔ وہ میری سُنائی ہوئی کہانیاں مجھے سُناتے رہے۔ ماں، باپ، بہن، بھائی، دوست میرے لئے تو اِن سب رشتوں کا نام بھائی جان تھا۔

ہم چار بہنوں کے وہ ایک ہی تو بھائی تھے۔ ابّا تو کب کے چھوڑ کے جا چکے تھے۔ باہر کے سارے کام وہی کرتے۔ وہ کوئی چھوٹا موٹا کاروبار بھی کرتے تھے اور جو تھوڑی بہت آمدنی ہوتی وہ لا کر امّاں کو دے دیتے۔ امّاں بھی گھر پر بچوں پڑھاتی تھیں۔ فاخرہ آپی بھی ٹیچر تھیں اُن کی تنخواہ بھی تھی۔ مِل ملا کر دو وقت کی روٹی چل جاتی۔ ویسے یہ سب باتیں مجھے بعد میں معلوم ہوئیں۔

اور یہ تو مجھے تب معلوم ہوا کہ وہ ہمارے سگے بھائی نہیں ہیں۔ جب میں اٹھارہ برس کی تھی سب سے بڑی صفیہ آپا تو تین سال پہلے بیاہ کر اپنے میاں کے ساتھ لاہور چلی گئی تھیں۔ اور اب فاخرہ آپی کی شادی کی بات بھائی جان کے ساتھ چل رہی تھی...... اور یہ بھید بھی تبھی مجھ

پر کھلا کہ وہ ہمارے تایازاد ہیں۔ مگر اس خبر سے مجھے ذرا بھی فرق نہ پڑا۔ باقی تو سب غالباً شروع سے جانتے تھے۔

میں نے سُنا فاخرہ آپی اپنی سہیلی سے کہہ رہی تھیں۔ میں اپنی عمر سے دُگنے چٹے اَن پڑھ سے شادی کیوں کروں۔ امّاں بھی حد کرتی ہیں۔ آصف کی محبت بیٹی کی محبت سے بڑھی ہوئی ہے۔ کہتی ہیں۔ "چلو" وہ اَن پڑھ ہے تم تو پڑھی لکھی ہو، کماتی ہو مل جُل کر گزارہ ہو جائے گا۔ رزق اللہ نے مقدر میں لکھ دیا ہے وہ تو مل کر ہی رہے گا"

"ہے کہ نہیں اندھیر؟"

"ہاں تم جیسی حسین اور پڑھی لکھی لڑکی کے لیے رشتوں کی کمی ہے کیا؟"

"بے شک۔ اور اگر زبردستی کی گئی تو ڈولی کی جگہ میرا جنازہ اُٹھے گا۔"

اور اس طرح مجھے معلوم ہوا کہ بھائی جان اَن پڑھ ہیں۔ اخبار تو وہ پڑھتے تھے اور اپنے کاروبار کا حساب بھی لکھتے تھے۔

فاخرہ آپی کے انکار سے گھر کی فضا میں تناؤ سا آ گیا تھا۔

فاخرہ آپی مجھے ایک آنکھ نہ بھاتیں۔ یوں لئے دیئے رہتیں جیسے وہ ملکہ ہوں اور ہم رعایا۔ اپنے حُسن کا اُنھیں خاصا احساس تھا اور کماؤ ہونے کا غرور بھی۔ اُن کے بھائی جان کو اتنی حقارت سے رَد کر دینے پر مجھے غصہ تو بہت آیا مگر پھر جل کر سوچا "چلو اچھا ہے اِس مغرور اور غصیلی لڑکی کی بھائی جان سے شادی نہیں ہوئی۔ خواہ مخواہ اُنہیں بھی پریشان کرتی امّاں بھی بہت اُداس اور دُکھی تھیں۔ بھائی جان کو کیسا لگا؟ کچھ معلوم نہیں۔ اُنہوں نے کسی ردِ عمل کا اظہار نہ کیا۔

فاخرہ آپی سے مایوس ہو کر امّاں نے اُس سے چھوٹی زائرہ آپا سے بھائی جان کی شادی کا ارادہ کیا تو وہ بھی نیر بہانے لگیں کہ اگر وہ فاخرہ آپی کے لیے بڑے ہیں تو میں تو اُن سے بھی چھوٹی ہوں...... سو یہ بیل بھی منڈھے نہ چڑھی...... بھائی جان لاتعلق اور بے نیاز خاموش تماشائی کی طرح سب دیکھتے رہے۔ اُن کے روّیے میں ذرا بھی تبدیلی نہ آئی۔ وہی آنکھوں میں نرمی، آواز میں مٹھاس اور انداز میں ٹھہراؤ...... سب کچھ ویسا تھا۔ مگر شاید درحقیقت ویسا نہیں تھا۔

پھر بھائی جان ہفتے بھر کے لیے لاہور چلے گئے۔ لوٹے تو پتہ چلا کہ اُنہیں لاہور میں نوکری مل گئی ہے اور وہ جا رہے ہیں۔ رات کو امّاں نے اُنہیں اپنے کمرے میں بلایا۔ میں دروازے کے پاس سے گزر رہی تھی۔ اپنا نام سُن کر ٹھٹک گئی۔ اور دروازے سے لگ کر سُننے لگی۔

امّاں کہہ رہی تھیں...... ''آصف بیٹے! تم نے عمر بھر میری خدمت کی۔ دُکھ سُکھ میں ساتھ دیا، مل کر بوجھ ڈھویا اور اب اِن لڑکیوں نے مجھے شرمندہ کر دیا ہے۔ تمہارے سامنے میری نظریں نیچی کر دی ہیں۔ تم نہ جاؤ...... میں نے سوچا ہے نجیبہ سیدھی سادی بھولی بھالی ہے وہ 'نہ' نہیں کرے گی میں اُس کی شادی تم سے کر دیتی ہوں'' اور اُس لمحے مجھے لگا میں ایکدم ہی بہت بڑی ہو گئی ہوں۔

''کیا......؟'' مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میری اوپر کی سانس اُوپر اور تلے کی تلے رہ گئی۔

بھائی جان خاموش تھے۔ اب مجھے سنبھلنا مشکل ہو رہا تھا۔

پھر بھائی جان کی آواز اُبھری۔ ''نہیں امّاں، یہ ناممکن ہے۔ میں نجیبہ کو چھوٹی بہن نہیں بیٹی سمجھا ہے۔ وہ بھی مجھ سے باپ کی طرح محبت کرتی ہے۔ ضدیں کرتی ہے۔ ناز اُٹھواتی ہے۔ ایسا بھول کر بھی نہ سوچیے گا۔

میں نے اطمینان کی سانس لی۔ ڈگمگ ڈولتا بھائی جان کا بُت پھر سے اپنے استھان پر قائم ہو گیا۔ پھر مکمل خاموشی چھا گئی۔ میں نے دروازے کی جھری سے آنکھ لگا دی۔ امّاں اور بھائی جان دونوں رو رہے تھے۔ پھر بھائی جان بھیگی آواز میں بولے'' مجھے اپنی ماں تو یاد نہیں۔ مگر آپ کو میں نے ہمیشہ ماں سمجھا ہے۔ مجھے آپ کی نیت کا علم ہے بس یہ قسمتوں کے فیصلے ہوتے ہیں۔ آپ میرے دُعا کرتی رہا کریں امّاں نے پوچھا۔ ''کیا نوکری ملی ہے بیٹے؟''

''مجھ جیسے بے زر، بے پر، اَن پڑھ کو کیا نوکری مل سکتی ہے'' اُف کتنا دُکھ تھا بھائی جان کی آواز میں ایک فیکٹری میں ملازمت ملی ہے۔ بڑے شہروں میں اور سو کام، سو موقعے نکل آتے ہیں۔

اور پھر بھائی جان چلے گئے۔ اگرچہ میں بہت اُداس ہوئی مگر مجھے معلوم تھا کہ اب اُنکا

چلا جانا ہی بہتر تھا۔ میں کئی روز تک بھائی جان کے متعلق سوچتی رہی۔ بھائی جان کو اپنی ماں یاد نہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ بہت چھوٹے تھے۔ تو باپ کے ساتھ وہ کس عمر تک رہے؟ انہوں نے انہیں پڑھایا کیوں نہیں؟ اگر وہ بھی جلدی فوت ہو گئے تھے تو وہ ہمارے پاس کس عمر میں آئے؟ پھر بابا نے انہیں کیوں نہیں پڑھایا؟ سوال ہی سوال تھے اور جن کے جواب غالباً میرے علاوہ سب کو معلوم تھے میں قصے کہانیوں کی دُنیا میں رہنے والی تھی مجھے اپنے گرد و پیش سے کوئی خاص سروکار نہیں تھا جو بات از خود سامنے آ جاتی معلوم ہو جاتی ورنہ میں بے خبر ہی رہتی۔ اب اگر میں حقائق جان بھی لیتی تو بھی حالات تو نہیں بدل سکتے تھے نا۔ میں یہ سوچ کر خاموش ہو گئی۔

پھر چند ماہ بعد بھائی جان کی شادی کی خبر ملی۔ اُن کا تایا جان کی بیٹی کے ساتھ سادگی سے نکاح ہو گیا تھا۔

''اچھا ہے۔ اُس کا گھر تو بس گیا۔ اللہ اسے شاد آباد رکھے۔'' امّاں نے بھائی جان کو دُعا دی ''اللہ کرے بیٹی ماں جیسی نہ ہو۔ آصف کی زندگی چین سے گزرے۔

''کیسی ہے اُس کی ماں؟'' لمحہ بھر کو میرے ذہن میں سوال اُبھرا مگر حسب عادت میں نے پوچھا نہیں۔

کچھ اور وقت سرکا۔ فاخرہ آپی کی شادی ہوئی۔ سال بھر بعد زائرہ آپی بھی اپنے گھر کی ہو گئیں میری شادی بھی طے ہو گئی تھی اور ابھی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ امّاں کی سدا کی کمزور صحت جواب دے گئی۔ ذمہ داری، نادار، بیماری اور اکلاپے کی دیمک اندر ہی اندر کب سے چاٹ رہی تھی اُن کا نازک وجود کب تک مقابلہ کرتا۔ آخر ہار گئیں اور خود کو فرشتۂ اجل کے حوالے کر دیا۔

بھائی جان کو پہنچنے میں دیر ہو گئی۔ باہر سے ہی جنازے میں جا شامل ہوئے۔ قبرستان میں آخری دیدار کیا۔ گھر آئے اور امّاں کے کمرے کی چوکھٹ سے سر لگائے روتے رہے۔ اگلے دن وہ واپس چلے گئے۔

طے یہ پایا کہ چہلم کے بعد مجھے سادگی سے رخصت کر دیا جائے کہ یہ اکیلی جان کہاں دَر دَر بھٹکے گی۔ اپنے ٹھکانے لگے۔

شادی کے بعد میں اپنے میاں کے ساتھ انگلینڈ چلی گئی۔ اللہ نے پیسہ دیا اور آسودگی بھی۔ زندگی پھر سے رواں دواں ہوگئی۔ دو سال بعد واپس آئی تو لاہور ایئر پورٹ پر اُترتے ہی مجھے پہلا خیال بھائی جان کو ملنے کا آیا۔ بھابھی اور بچوں سے ملنے کا بھی بہت اشتیاق تھا۔ صفیہ آپا سے معلوم ہوا کہ شادی کے بعد اُنہوں نے ملازمت چھوڑ دی ہے اور اندرون شہر کریانہ کی دکان کھول لی ہے اور قریب ہی کہیں رہتے ہیں۔ اُن کی بیوی ہم لوگوں سے ملنا پسند نہیں کرتی اسلئے رابطہ نہیں ہے۔

میں بھائی جان سے ملنے سیدھی دُکان جا پہنچی۔ وہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے۔

کسی کو بھی آپ کا گھر معلوم نہیں تھا اور مجھے آپ سے ضرور ملنا تھا اس لیے یہاں چلی آئی۔ ٹھیک؟'' ''ٹھیک'' وہ مسکرائے میں بھائی جان کو جب بھی ملتی۔ درمیان کے ماہ و سال ہوا بن کر اُڑ جاتے۔ میں پھر سے اُن کی لاڈلی مُنی بن جاتی اور وہ میرے بھائی جان۔

''چلیں اُنھیں گھر چلیں۔ میں نے بھابی کو ملنا ہے اور کیا نام ہیں اُن کے...... اُن کو بھی۔

اُنہوں نے میرے ساتھ ایک لڑکے کو کر دیا اور گھر بھجوا دیا اور کہا کہ وہ کسی کو دُکان پر بٹھا کر تھوڑی دیر میں آتے ہیں۔

''اچھا، نان کباب لیتے آیئے گا'' میں نے فرمائش کر دی

''ٹھیک ہے لے آؤں گا'' پھر مُسکرا کر اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ ''پگلی''

بھائی جان کے گھر کے دروازے تک پہنچتے پہنچتے میں بیحد اُداس ہوگئی۔ گھر دُکان سے زیادہ دُور نہیں تھا۔ اندرون شہر کی سیلن اور چمڑے کی بُو سے بھری ہوئی اُس کئی منزلہ عمارت میں بھری دوپہر میں بھی اتنا اندھیرا تھا کہ مدھم سے بلب کی پیلی روشنی میں سیڑھیاں بمشکل دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ بھابی نے دروازہ کھولا۔

''میں نجیبہ ہوں بھابھی''

بھابی نے خاموشی سے راستہ دے دیا۔ بھابھی کو بھاگ کر گلے لگانے کی آرزو پر اُن کی سرد مہری نے اوس ڈال دی۔

دراز قد، چھریرا بدن، گوری رنگت، لمبی لمبی بھوری آنکھیں، کمرے سے نیچے تک لٹکتے

ملائم سنہرے بال، سبک ناک نقشہ، گہری تراش کے گلے اور چھوٹی چھوٹی آستینوں والے جدید
فیشن کے لباس میں وہ خوب جچ رہی تھی۔

"آپ تو بہت پیاری ہیں بھابی" اُس کی سرد مہری کے باوجود میں اپنی خوشی نہ دبا سکی۔

"چھوٹی ہوں تم سے نام لے سکتی ہو میرا......شگوفہ" اُنہوں نے اپنی عمر جتانے
کو "چھوٹی" کا لفظ چبا کر بولا

"رشتے میں بڑی ہیں آپ" میں نے آہستہ سے کہا

میں بجھ سی گئی۔ میرا سارا اشتیاق سرد پڑ گیا۔ اُنہوں نے مجھے بیٹھنے کو بھی نہ کہا۔ میں چار
پائی کے ایک کونے پر ٹِک گئی۔ آنکھوں میں اُترتی نمی کو چھپانے کے لیے میں نے اِدھر اُدھر
نگاہ دوڑائی۔ اِسی واحد کمرے پر مشتمل اِس گھر میں بیرونی دروازے کے مقابل ایک سلاخ
دار کھڑکی تو تھی مگر سامنے ایک خستہ حال عمارت روشنی اور ہوا کا راستہ روکے کھڑی تھی۔ کمرے
میں دو چار پائیوں کے علاوہ ایک کرسی اور میز تھی۔ میز پر شیشہ کنگھی، میک اَپ اور شیو کا سامان
رکھا تھا۔ ایک کونے میں مٹی کے تیل کا ایک چولھا، پلاسٹک کی ایک بڑی ٹوکری میں کچھ برتن
اور ساتھ ہی دیوار میں بنی بے کواڑ الماری میں کھانا پکانے کا سامان رکھا تھا۔ چار پائی کے نیچے
کپڑوں کے دو ٹرنک رکھے تھے۔ دیوار گیر پر تولیہ اور دو ایک کپڑے جھول رہے تھے اِس سے
زیادہ سامان کی اِس کمرے میں گنجائش ہی نہ تھی۔ کمرے میں نہ کوئی پانی کا نل تھا اور نہ باتھ
روم وغیرہ۔ سامنے کی چار پائی پر گڑیا سی ثمارا سو رہی تھی۔ دو بچوں کے ساتھ ایسی رہائش میرا دِ
دُکھ گیا۔

"آج میرا خیال کیسے آ گیا، تم تو باہر سے ہی آصف کو مل کر چلی جاتی ہو۔ سمجھ میں نہیں
آتا......ایسی ہی محبت تھی تو تمہاری ماں نے ساری عمر اُس کی کمائی کھانے کے بعد خالی ہاتھ
دھتکارا کیوں؟ آخر میری ماں نے ہی اِسے گلے لگایا۔ میں پڑھی لکھی نہیں تھی نا اِس لیے ماں
نے بڈھے کے پلے باندھ دیا تو میں نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ اُس نے پڑھی لکھی کا لفظ یوں
زور دے کر ادا کیا۔ جیسے پڑھی لکھی کوئی گالی ہو۔ اُف کیسا زہر بھرا اُسکے لہجے میں۔

میں کچھ بھی سوچ لیتی مگر اس سلوک کی توقع ہرگز نہیں کر رہی تھی جب کہ وہ عمر میں مجھ
سے چھوٹی بھی تھی وہ اَن پڑھ ہی نہیں بدتمیز بھی تھی۔ اب مجھے اماں کی دُعا یاد آئی اور اُس کا

مطلب بھی خوب اچھی طرح سمجھ میں آ گیا اور ایک سرد آہ میرے اندر گھٹ کر رہ گئی۔ اب میرا وہاں رُکنے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا مگر بھائی جان کے آنے تک تو بیٹھنا ہی تھا۔ ڈھیٹ بن کر پوچھا۔

"واصف کب آئے گا؟"

اپنے دل کی بھڑاس نکال لینے اور میرے چُپ رہنے پر اُس کا لہجہ اب تبدیل تھا۔ "بس آتا ہی ہوگا" ذرا سی دیر میں واصف آ گیا۔

"چائے پیو گی" بھابی نے پوچھا

"نہیں کھانا کھاؤں گی"

"کھانا؟" بھابی کی پیشانی شکن آلود ہو گئی

"ہاں کھانا، میں نے واصف کے ساتھ "زیرو کاٹا" کا کھیل جاری رکھتے ہوئے جواب دیا

"بھائی جان نان کباب لا رہے ہیں۔"

بھائی جان کے آنے پر کھانا ہوا۔ اُنھوں نے بھابی کو بتایا کہ یہ نجیبہ میری بہن، میری مُنی ہے۔ بھائی جان جانے لگے تو میں بھی ساتھ ہی نکل گئی۔ آتے ہوئے میں نے چپکے سے کچھ نوٹ واصف کی مٹھی میں تھما دیے اُن کی رہائش اُن کے حالات کی غمازی کر رہی تھی۔

صفیہ آپا کہتی ہیں۔ شگوفہ فضول خرچ ہے، بدسلیقہ ہے۔ حالات کے مطابق کفایت شعاری سے کام نہیں لیتی۔ ایک سے ایک فیشن، تفریح، باہر سے کھانا پینا، اپنا ہر شوق پورا کرتی ہے اُس کے بعد جو بھی ہوا اُسے کوئی غرض نہیں۔ مانا کم عمر ہے۔ مگر اب تو دو بچوں کی ماں ہے۔ اُنہی کی خاطر عقل کے ناخن لے۔" پھر اُنہوں نے مجھے بھی سرزنش کی۔ "ذرا تم اِن سے دور ہی رہو محترمہ، جانتی نہیں ہو کس ماں کی بیٹی ہے۔"

شگوفہ نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا میں نے آپا کو نہیں بتایا۔

اور تیسرے روز میں پھر اُن کے دروازے پر کھڑی تھی۔ میری دستک پر شگوفہ نے دروازہ کھولا وہ حسبِ معمول بنی ٹھنی کھڑی تھیں۔ مجھے دیکھ کر اُن کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

"بھابی میرے پاس دراصل صرف آج کا دن تھا! اسلئے آپ سے ملنے چلی آئی" اُن

کے چہرے کے اثرات نہ بدلے بس دروازے کے بیچ سے ہٹ گئیں۔ میں نے بلا تمہید کہنا شروع کر دیا۔

''مجھے بزرگوں کے اعمال و افعال سے کوئی واسطہ نہیں اور نہ میں اُن کی ذمہ دار ہوں۔ بھائی جان میرے بھائی اور آپ بھابی ہیں...... آج میں آپ سے ایک حق مانگنے آئی ہوں۔''

''ہمارے پاس کیا رکھا ہے کسی کو دینے کے لیے۔'' اُنہوں نے تیزی سے کہا۔

''میں وہی مانگوں گی جو آپ کے پاس ہوگا۔ آپ مجھے اپنے بھتیجے کو اچھی تعلیم دلوانے کا حق دے دیں۔''

''یعنی؟'' اُنہوں نے تیکھے لہجے سوال بھی کیا اور وضاحت بھی چاہی۔

''یعنی اس کے تعلیمی اخراجات کی ذمہ داری میری ہوگی آپ اسے کسی اچھے سکول میں پڑھائیں اور اس پر توجہ دیں۔ آپ تو دیکھ ہی رہی ہیں تعلیم کے بغیر زندگی کتنی مشکل ہوتی ہے۔''

میں نے مختلف تاریخوں کے سال بھر کے لیے چیک دیتے ہوئے کہا۔

بس بھابی اب آپ انکار نہیں کریں گی۔ محبتوں کے بھی کچھ قرض ہوتے ہیں۔ مجھے یہ قرض ادا کرنے دیں۔'' بھابی گھر بھی بدل لیں'' میں نے مزید اضافہ کیا کچھ بھی ہو ایک جوان اور حسین عورت کا دو معصوم بچوں کے ساتھ ایسی جگہ رہنا۔ جہاں مشترکہ بیت الخلا اور غسل خانے ہوں اور جہاں دیگر ضروریات کے لیے پانی مشترکہ نل سے لانا پڑے۔ انتہائی ناموزوں تھا۔

میں نے کچھ نقد رقم میز پر شیشے کے نیچے پہلے ہی رکھ دی تھی۔ رخصت ہوتے وقت میں اُنہیں گلے ملی تو اُنہوں نے کہا۔'' آصف سچ کہتا ہے نجیبہ سب سے الگ ہے۔''

میں نے اپنے میاں کو بتایا تو وہ بولے...... ''بہت اچھا کیا مجھ پر بھی آصف بھائی کے کئی احسان ہیں۔ جب میں نے لاہور میں میڈیکل کالج میں داخلہ لیا تو ہوسٹل میں جگہ ملنے تک میں اُن کے ساتھ رہا۔ ابھی اُن کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ کھانے پینے ہر چیز کا خیال رکھا اور ایک پائی تک لینے کو نہیں مانے۔ بڑے دل والے آدمی ہیں۔''

''اور بڑے ظرف والے بھی۔ ہماری طرف سے جو کچھ اُن کے ساتھ ہوا۔ اُنہوں نے

منہ سے بھاپ تک نہیں نکالی'' اگلے چند سال تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اُنہوں نے گھر بدل لیا تھا اور اُن کے کنبے میں دو اور بیٹوں کا اضافہ ہو چکا تھا۔

میں ہر ٹرپ میں اُن کے گھر ایک بار ضرور جاتی بھابی نہ مجھ سے بے تکلف ہوئیں نہ دوستی کی بس ٹھیک سے بات کر لیتیں۔ بچے بھی دور دور رہتے۔ چونکہ میں بلا اطلاع جاتی تھی اِس لیے اکثر بھائی جان بھی نہ ہوتے۔ کبھی کبھار ملاقات ہوتی۔ اس کے باوجود میرے دل میں اُن کی عزت و احترام میں کوئی فرق نہ آیا وہ بچپن سے میرے دل میں بہت گہرے اُترے ہوئے تھے۔ اس بار میں گئی تو بھی وہ گھر پر نہیں تھے۔ میں بچوں کو پھل مٹھائی اور بھابی کو چیک دے کر چلی آئی۔ یہ جان کر مجھے دُکھ ہوا کہ واصف کو پڑھنے کا شوق نہیں ہے۔ بس مارے دھکیلے چل رہا ہے۔ میں جب گاڑی میں بیٹھ رہی تھی میں نے دیکھا بھائی جان آ رہے ہیں۔ میں رُک گئی کہ کم از کم اُنہیں سلام ہی کر لُوں۔

بھائی جان ملگجا ہلکہ میلا سا شلوار کُرتا پہنے ہوئے تھے جو پسینے میں بھیگ کر اُن کے بدن سے چپکا ہوا تھا۔ کندھے اور جیب کے قریب سلائی اُدھڑی ہوئی تھی۔ بال کم ہو رہے تھے رنگت بجھی ہوئی تھی۔ وہ کافی کمزور لگ رہے تھے۔ میرا دل بھر آیا۔

اگر بھائی جان کے والدین کا انتقال نہ ہوتا...... اگر وہ غیر تعلیم یافتہ نہ ہوتے............ اگر یہ بے عقل و بے تمیز لڑکی اُن کی بیوی نہ ہوتی...... تو شاید یہ زندگی اُن کا مقدر نہ بنتی۔ لیکن یہ سارے اگر اور کاش کبھی پُورے ہوئے ہیں؟ میں نے دُکھ سے سوچا۔

اگلے دن میری واپسی تھی۔ ایک دو دن تو سیٹل ہونے میں لگ جاتے ہیں۔ تیسرے دن میں اپنے ہینڈ بیگ میں سے کاغذات نکال کر چیک کرنے لگی تو اُن میں سے بھائی جان کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک خط نظر پڑا جو غالباً میں اپنے کاغذات کے ساتھ سمیٹ کر اُٹھا لائی تھی۔ میرے ذہن میں بھائی جان کا اِس بار کا حلیہ آیا اور میں نے بلا ارادہ ہی اُن کی کچی پکی لکھائی میں املا کی غلطیوں سے پُر خط پڑھنا شروع کر دیا۔ معلوم نہیں وہ خط کس کو لکھا گیا تھا۔ کیونکہ وہ صرف جناب والا سے شروع ہوتا تھا۔ لکھا تھا

''شگوفہ آپ کے جانے کے بعد بہت اُداس ہوئی۔ مجھ سے اپنے سامنے خط لکھوایا اور پھر برستی بارش میں خود جا کر ڈاک میں ڈال آئی۔ روزانہ ہر ایک سے پوچھتی تھی۔ وہی خط

کتنے دن میں پہنچتا ہے۔ ایک ایک دن گن گن کر کاٹا۔ بے چین بے چین پھرتی۔ آپ کا جواب آیا تو خوشی سے دیوانی سی ہوگئی۔ مٹھائی بانٹی...... اور اُسی وقت جواب لکھنے کی ضد کرنے لگی۔ میں نے ذرا سستی کی اور کہا کہ کل لکھ دونگا۔ تو پڑوس میں اپنی سہیلی سے لکھوا کر ڈاک کے حوالے کر کے ہی گھر لوٹی۔ وہ تو آپ کے پیچھے پاگل ہوئی پھرتی ہے اور جناب کو کچھ خبر ہی نہیں ہے اور جو وعدے آپ اُس سے کر گئے تھے وہ بھی حضور کو یاد ہیں کہ نہیں میں جانتا ہوں آپ بہت مصروف شخص ہیں۔ مگر کسی کی بے قراری کا ہی خیال کر لیں......" ایک ایک لفظ تیر کی طرح میرے دل میں گزرتا چلا گیا۔

میں سُن سی بیٹھی تھی اور سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ مجھے کس بات کا دُکھ زیادہ ہے۔ بھائی جان کی انا کی دیوار میں دراڑیں پڑنے کا یا اُن کا اپنی بیوی کی دلالی کرنے...... یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے مگر اُن کی اپنی کچی پکی لکھائی میں املا کی غلطیوں سے بھرے انگاروں کی طرح دہکتے لفظ حقیقت تھے پوری رات عجیب اُلجھی اُلجھی سوچوں میں گزری۔ میرا دل اس بوجھ کو سہار نہیں پا رہا تھا۔ مجھے لگتا تھا میں دھماکے سے پھٹ جاؤں گی۔ میں اس بات کا ذکر اپنے شوہر سے بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اُن کی نظروں میں بھائی جان کی عزت کم ہو مجھے منظور نہ تھا۔

اور مجھ پر منکشف ہوا کہ بھائی جان نے تو مجھے اُس سے کہیں زیادہ لُوٹا ہے جتنا میں سمجھ رہی تھی۔ ایکدم ہی سارے رشتے چھن گئے تھے۔ میں یتیم ہو گئی تھی اور اُس کے ساتھ میں نے جو سب سے بڑی چیز کھوئی وہ انسان اور انسانیت پر اعتبار تھا۔ میرے اندر خلا ہی خلا تھا۔ میں بالکل کھوکھلی ہو گئی تھی۔

بھائی جان بچپن ہی سے میرے لیے ایک مثالی شخصیت تھے۔ میں نے ہر رشتے کو اُن کی ذات کے حوالے سے ہی جانا اور سمجھا تھا۔ اُن کی سادگی، سچائی، فراخدلی اور وسیع النظری نے میرے دل میں جو جگہ بنائی تھی وہ بہت بلند تھی۔ میری نظر میں وہ تب بھی اُتنے ہی بلند رہے جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ ان پڑھ ہیں۔ اُن کی مفلوک الحالی سے بھی اِن مقام میں کوئی فرق آیا۔ میں نے اُن کا بُت اپنے پیار، اعتبار اور معصومیت کے بہت اُونچے استھان پر سجا رکھا تھا اور جسے میں ہمیشہ سر اُٹھا کر بڑے فخر سے دیکھتی تھی۔ اب وہ استھان ریزہ ریزہ ہو کر بکھر بکھری

ریت میں تبدیل ہو گیا تھا اور اُس پر رکھا بُت از خود نیچے گر کر پاش پاش ہو گیا تھا اور پھر میرا اُن سے رابطہ رکھنے کو دل نہ چاہا۔

پچھلی بار میں پاکستان آئی۔ صفیہ آپا کے گھر گئی تو انہوں نے بتایا کہ بھائی جان آصف آئے ہوئے ہیں۔

''چلو آؤ، پہلے اُن سے مل لو'' اور میری ہچکچاہٹ پر توجہ دیئے بغیر میرا ہاتھ پکڑ کر دوسرے کمرے میں لے گئیں۔ بھائی جان لیٹے ہوئے تھے۔ ہمیں دیکھ کر اُٹھ کر بیٹھ گئے اُن کی ایک ٹانگ پر سے ذرا سی اٹھی ہوئی شلوار میں سے اُن کی پنڈلی دکھائی دے رہی تھی۔ ہڈی پر صرف جلد منڈھی ہوئی میں نے سلام کیا۔

''ارے تم یہاں کیسے...... کیسی ہو مُنی؟'' وہ حیران اور خوش ہو کر بولے۔

''آپ کیسے ہیں؟'' میں نے پوچھا

''اونچا بولو انہیں بہت کم سُنائی دیتا ہے۔'' آپا نے کہا

میرے حلق میں گولہ سا پھنسنے لگا۔ مجھ سے تو بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔ اُونچا کیسے بولتی۔ آپا نے خود ہی میری طرف سے دو چار جملے چلا چلا کر بولے اور وہ کچھ سمجھتے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے سر ہلاتے رہے۔ مجھ سے زیادہ دیر وہاں رُکا نہیں گیا۔ میں نے رقم آپا کو دیتے ہوئے کہا۔

''آپ اپنی طرف سے انہیں آلہ سماعت لگوا دیں''

صرف چھ مہینے بعد اپنی بیٹی کی تیاری کے سلسلے میں میرا پھر پاکستان چکر لگ گیا۔ معلوم ہوا کہ پچھلے ماہ بھائی جان کا انتقال ہو گیا۔ بڑی دیر اُن کی باتیں ہوتی رہیں۔ طرح طرح کے انکشافات ہوئے معلوم ہوا کہ شگوفہ نے بھائی جان سے علیحدگی اختیار کر لی تھی اور میکے کے شہر جا بسی تھی۔ بھائی جان مہینے میں ایک بار جا کر بچوں کا خرچہ دے آتے اور اُن سے مل کر واپس آ جاتے۔ اُن کی بیٹیوں کی شادیاں سسرالی خاندان میں ہو گئی تھیں۔ بیٹا زیادہ نہیں پڑھا بس سکول ٹیچر ہو گیا۔ بیٹے کی بھی شادی ہو گئی مگر ساس بہو میں اینٹ کتے کا بیر تھا۔ سو وہ چھوٹی بیٹی کے ساتھ رہ رہی تھی۔ آپا ساس بہو کی اَن بن کی وجوہات بتانے لگیں لیکن میری عدم دلچسپی دیکھتے ہوئے خود ہی بولیں

''تو بہنا آصف بھائی کی کہانی آصف کے ساتھ ختم ہوئی۔ ہمیں اور باتوں سے کیا

غرض۔'' مگر میرے لیے تو کہانی ختم ہونے پر پھر سے شروع ہو گئی ہے۔لگتا ہے دماغ کے تار آپس میں اُلجھ گئے ہیں کبھی کوئی منظر ذہن میں بنتا ہے۔کوئی تصویر ذہن میں اُبھرتی ہے۔اور ابھی وہ پوری طرح پہچان میں نہیں آئی ہوتی کہ غائب ہو جاتی ہے۔عجیب سی اُلجھن اور بے کلی میں مبتلا کر کے......اور جیسے ہی کچھ یاد آنے لگتا ہے کہ کئی خیال ایکدم یورش کر کے اُسے پیچھے دھکیل دیتے ہیں اور میں اُن خیالات کو ابھی الگ الگ بھی نہیں کر پاتی ڈھیری اُداسی اُن سب کو ڈھانپ لیتی ہے۔اُداسی کی دُھند میں لپٹی ادھوری تصویریں، انجانے خیالات اور اجنبی سوچیں بوکھلا دیتی ہیں۔

میں نے ذہن کے اُلجھے ہوئے تاروں کو سُلجھانے، پہلا سرا تلاش کرنے کی کوشش میں ہر یاد کو دہرایا ہے۔بچپن کی ہر یاد میں بھائی جان کی تصویر ہے۔جو درد بن کر آنکھوں میں جا چھلکتی ہے۔

کیا میں کبھی بھی بھائی جان سے نفرت کر سکی تھی؟

آنٹی

اس کے اور میرے درمیان ایک قدر مشترک تھی...... اور وہ تھی موٹاپا۔ ایک دن سجاد بھائی کہنے لگے کہ تم دونوں واک کیا کرو۔ میں نے کہا سجاد بھائی، "میں چاہتی تو ہوں مگر سستی ہو جاتی ہے۔" وہ بولے، "کچھ یہی حال شکیل کا ہے۔ تم دونوں ایک دوسرے کو بلا لیا کرو، اکٹھے واک کر لیا کرو۔ اس طرح باقاعدگی سے ہو جایا کرے گی۔" شکیل یہ تجویز سن کر کھل اٹھا۔

شام کو وہ میرے دروازے پر موجود تھا۔ "چلیں آنٹی!" اور میں بادل نخواستہ چل پڑی۔ وہ بڑے آرام سے ٹہل ٹہل کر چل رہا تھا۔ "ارے اس طرح چلنے کا کوئی فائدہ نہیں، تیز چلو۔" اور میں اس سے تھوڑا آگے نکل گئی۔

"مجھے تو سردی لگ رہی ہے، آپ کو نہیں لگ رہی؟" اس نے پوچھا۔ "ذرا دیکھیں، میرے ہاتھ کتنے ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔" اس نے اپنے ہاتھ میرے سامنے کر دیے۔

"کچھ نہیں ہوتا۔" میں نے اس کی نزاکتوں سے چڑ کر کہا۔ "ذرا تیز چلو گے تو سردی نہیں لگے گی اور دوسرے تیسرے چکر میں تو پسینہ آنے لگتا ہے۔"

"اچھا!" اس نے آنکھیں پھیلا کر کہا۔ اور پھر بجائے چلنے کے وہ فٹ پاتھ کے کنارے بیٹھ گیا۔ "میں نہیں چل سکتا آپ کے ساتھ...... آپ تو لگتا ہے آگ بجھانے جا رہی

ہیں۔میں بیٹھا ہوں، آپ نے جتنا چلنا ہے چل لیں، پھر گھر واپس چلیں گے۔''

میں نے ایک چکر لگایا اور پھر مجھے عجیب سا لگنے لگا۔''چلو اٹھو گھر چلتے ہیں۔''

''مگر کیوں؟ آپ جتنا واک کرنا چاہتی ہیں کر لیں۔''

''جب مجھے اکیلے ہی چلنا ہے تو تمہیں فٹ پاتھ پر بٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔''

''نہیں، مجھے اچھا لگ رہا تھا۔''

''فٹ پاتھ پر بیٹھنا؟''میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''نہیں، آپ کو دیکھنا، آپ کپڑے بہت اچھے پہنتی ہیں۔''

میری ہنسی رک گئی۔اس کا لہجہ کچھ عجیب سا تھا۔

''اپریل ختم ہونے کو ہے اور سردی ہے کہ ابھی تک جان نہیں چھوڑ رہی۔لگتا ہے بارش ہونے والی ہے۔''میں نے آسمان کو دیکھتے ہوئے کہا اور اس کی بات سنی ان سنی کر دی۔

وہ زبان سے مجھے آنٹی کہتا تھا مگر اس کی نظریں کچھ اور کہتی تھیں۔میں متذبذب تھی۔ ممکن ہے مجھے دھوکہ ہو رہا ہے عورت کا فہم و ادراک اس معاملے میں بہت تیز ہوتا ہے۔وہ تو مخفی اشاروں کو بھی پا جاتی ہے اور یہاں تو سب کچھ سطح پر دھرا تھا۔اور پھر میرے شبے کی تصدیق ہو گئی کہ اس کی بیوی مجھ سے کٹی کٹی سی رہنے لگی۔وہ ہسپتال سے گھر فون کرتی اور شکیل نہ ملتا تو وہ میرے گھر فون کرتی کہ شکیل آپ کی طرف ہیں؟ میرے انکار پر بھی وہ کہتی کہ اچھا انہیں کہہ دینا کہ مجھے کال کریں۔اس کی یہ بے یقینی مجھے بہت بری لگتی۔لیکن اس کا مطلب ہے جو میں سمجھ رہی ہوں وہ سچ ہے۔کیونکہ اس کی بیوی نے بھی محسوس کر لیا تھا۔یہ جاننے کے بعد میں نے اسے نظرانداز کرنا شروع کر دیا۔میرا گریز اس کے اشتیاق میں اضافہ کرتا گیا۔مگر یہ بات میرے لیے تعجب کا باعث تھی کہ میں جوان بچوں کی ماں ہوں، ظاہر ہے میں نہ کم عمر ہوں اور نہ غیر معمولی حسین۔پھر اس کو یہ خیال کیوں آیا اور پھر چند مہینوں بعد ہم ان کے پڑوس سے اٹھ آئے۔میرے بچوں نے دوسری یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔

کرسمس کی رونق اور ہنگامہ عروج پر تھا۔اس کا فون آیا۔اتفاق سے میں نے ہی اٹھایا۔

بولا...... ''کرسمس پہ کیا کر رہی ہیں آپ؟''

''کچھ بھی نہیں کر رہی، میں کوئی عیسائی ہوں۔''

''میرا مطلب ہے، کسی پارٹی وارٹی میں جارہی ہیں؟''

میں نے کہا۔''کرسمس کی پارٹی میں تو نہیں، البتہ نئے سال کی پارٹی میں پڑوسن نے بلایا ہے، اس لیے چلی جاؤں گی کہ تھوڑی بہت پڑوسیوں سے بھی جان پہچان ہونی چاہیے۔ ہم صرف اپنے پاکستانیوں سے ملتے ہیں۔ کم از کم یہ تو معلوم ہو کہ ہمارے پڑوسی کون ہیں۔ بچوں کو نہیں لے جاؤں گی، اکیلی جاؤں گی کیونکہ مجھے اندازہ نہیں کہ ماحول کیسا ہوگا۔''

خوش ہو کر بولا۔''تو پھر میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔''

اور جب میں نئے سال کی پارٹی میں جانے کے لیے تیار ہو کر نیچے اتری تو شکیل کو موجود پایا۔

''تم تو سچ مچ آ گئے۔'' میرے منہ سے غیر ارادی طور پر نکل گیا۔

مجھے شرمندگی بھی ہوئی کہ اتنی مدت بعد ہمارے گھر آیا ہے۔ میزبانی کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں۔ مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔ مگر اس نے بالکل محسوس نہیں کیا۔ وہ غالباً کسی چیز کو سنجیدگی سے لیتا ہی نہیں تھا۔ بعض دفعہ بحث و تمحیص میں، میں اس سے ایسی ایسی باتیں ایسے سخت لہجے میں کہہ جاتی تھی جو کسی اور کو کہنے کا میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ لیکن وہ اس معاملے میں بہت مستقل مزاج تھا۔ اس نے شرمندہ ہونا اور برا ماننا سیکھا ہی نہیں تھا۔ اس نوع کی مستقل مزاجی میں نے اکثر دل پھینک قسم کے لوگوں میں دیکھی ہے۔ اس لیے میں اسے اس کی خوبی ماننے کو تیار نہ تھی بلکہ یہ اس کے سطحی ہونے کی ایک اور دلیل تھی۔

نئے سال کی پارٹیوں سے میں کافی خوفزدہ تھی کیونکہ پاکستان میں ہی یہ ایسی ہوتی تھیں کہ لوگ آپے سے باہر ہو جاتے تھے اور پھر یہ تو امریکہ ہے اور پارٹی بھی خالص امریکنوں کے گھر ہے جو نہ ہو کم ہے۔ اس لیے احتیاطاً میں نے پڑوسن کو پہلے ہی فون کر دیا تھا کہ بارہ بجے کی فلائیٹ سے میرے کچھ مہمان دوسرے شہر سے آ رہے ہیں۔ میں آؤں گی ضرور مگر ساڑھے گیارہ بجے واپس چلی جاؤں گی۔ کیونکہ اصل ہنگامہ تو بارہ بجے کے بعد شروع ہوتا ہے۔

بہر حال میں اور شکیل گئے۔ خاتون خانہ نے دروازے پر استقبال کیا۔ میرے تعارف کرانے سے پہلے ہی شکیل نے خود ہی اپنا تعارف کرا دیا کہ میں ان کا کزن ہوں۔

''یہ آج اچانک تم میرے کزن کیسے ہو گئے...... میں تو بتانے والی تھی کہ تم میرے بھتیجے

ہو۔"

"اب میں اتنا چھوٹا بھی نہیں ہوں۔"

"تو معلوم ہے تمہیں!" میں نے طنزیہ کہا۔

اس نے بڑی ڈھٹائی سے اعتراف کیا کہ آنٹی تو وہ صرف اس لیے کہتا ہے کہ کسی کا ذہن ادھر نہ جائے۔

"تم سمجھتے ہو لوگ پاگل ہیں، جو تم سمجھانا چاہو گے وہی سمجھیں گے وہ...... رشتوں کی توہین نہ کرو شکیل۔" مجھے اس کا اپنی کمینگی کا یوں برملا اعتراف بہت برا لگا۔

پارٹی کا ماحول بہت سادہ اور گھریلو تھا۔ عورتیں اکٹھی بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ دو ننھے منے تین چار ماہ کے بچے ان کی توجہ کا مرکز تھے۔ اور وہ سب انہیں دیکھ کر بہت خوش ہو رہی تھیں۔ مرد پینے پلانے میں مصروف تھے اور چل پھر رہے تھے۔ چھوٹے بچے کہیں الگ ویڈیو گیمز میں مگن تھے۔ اور نوجوان لڑکے لڑکیاں کہیں الگ اپنے کھیل کود میں مگن تھے۔ انہوں نے مجھے بڑی احتیاط سے سافٹ ڈرنک پیش کیا اور پھر کھانے میں ساتھ ساتھ رہنمائی کرتی رہیں کہ کس کس کھانے میں پورک ہے۔ میں نے سبزیوں کا سوپ اور سلاد وغیرہ لی۔ اور ابھی وہ میوزک وغیرہ سیٹ کر رہے تھے کہ حسب پروگرام میں اٹھ بیٹھی۔ شکیل حیران ہو گیا۔

"یہ کیا...... اصل پارٹی تو اب شروع ہو گی۔"

"تو تم رک جاؤ، میں تو چلتی ہوں۔"

"کیسے رکوں...... کیا فائدہ؟ سب لوگ اپنے ساتھی ساتھ لائے ہوں گے۔ میں نے سوچا تھا آپ کے ساتھ ڈانس کروں گا۔ ڈانس آتا ہے نا آپ کو؟"

"ہاں آتا ہے، مگر میں رک نہیں رہی۔ ارے بہت لڑکیاں ہیں، چانس مل جائے گا تمہیں۔"

"آپ ہی چانس نہیں دیتیں تو اور کون دے گا؟"

"آج تم نے پی تو نہیں رکھی؟" میں نے چڑ کر کہا۔

مگر اس پر حسب معمول کوئی اثر نہ ہوا۔ خیر میں اجازت طلب کر کے آ گئی۔ وہ بھی میرے ساتھ آ گیا۔ ہمارا گھر چند قدم کے فاصلے پر ہی تھا مگر اس نے کہا، تھوڑی دیر ٹہلتے ہیں۔

وہ بڑا پشیمان دکھائی دے رہا تھا اس لیے نہیں کہ میں نے اس کی بات کا برا مانا تھا بلکہ اس لیے کہ ایسے موسم میں وہ اتنی لمبی ڈرائیو کر کے بھی آیا ہے اور یہاں حسب توقع کچھ بھی نہ ہو سکا۔

میں نے بھی سوچا ذرا اس کو سمجھا ہی دوں، اس کے ساتھ سیدھی سٹریٹ پر ٹہلتے ہوئے میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ...... ''دیکھو، شکیل! اچھے خاندان سے ہو، پڑھے لکھے ہو، ڈاکٹر ہو، تمہاری خاصی خوبصورت بیوی ہے، یوں ندیدوں کی طرح کیوں ادھر ادھر منہ مارتے پھرتے ہو...... کوئی وجہ بھی تو ہو۔ اور دوسری بات کہ تم مجھ سے یہ توقع کیوں کرتے ہو کہ میں اپنے شوہر سے بددیانتی کروں گی۔ کیا میں تمہیں اتنی گھٹیا دکھائی دیتی ہوں۔ مجھے آنٹی کہتے ہو، کچھ اس کا بھی لحاظ ہے؟''

ٹھیک ہے میں اسے ڈھیٹ، سطحی اور دل پھینک سمجھتی تھی مگر اس کا جواب میری ہر توقع سے زیادہ گھٹیا تھا۔

''میں نے کب کہا ہے کہ میری بیوی خوبصورت نہیں ہے لیکن روز روز کھانا کھاتے کھاتے اچار، چٹنی کے لیے بھی تو دل چاہتا ہے اور اس میں بددیانتی کی کیا بات ہے...... آپ اپنی ہر ذمہ داری پوری کر رہی ہیں، کیا یہ کافی نہیں۔''

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ یہ شخص اتنا بدسلیقہ ہے کہ اچھے الفاظ میں بھی بات نہیں کر سکا۔ مجھے اپنی شدید توہین محسوس ہوئی۔

''اگر کوئی اس طرح تمہاری بیوی سے کہے اور وہ بھی چونکہ ساری ذمہ داریاں پوری کر رہی ہے، تو تمہارے خیال کے مطابق کوئی بددیانتی نہیں ہوگی...... اگر وہ اس کی پیشکش قبول کر لے تو؟''

میں نے اپنی دانست میں اسے چاروں شانے چت گرا دیا اور ہم گھر میں داخل ہو گئے۔ لیکن خدا جانے وہ کس مٹی کا بنا ہوا تھا۔ جب ہمارے اتنے جلدی لوٹنے پر بچوں نے حیرت کا اظہار کیا تو وہ اپنے اسی لاابالی انداز اور شگفتہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ''ارے آنٹی! خواہ مخواہ ہی ڈر گئیں۔ دیکھ تو لینا چاہیے تھا۔ سنی سنائی کا کیا ہے، آنکھوں دیکھی بات اور ہوتی ہے۔ آنٹی نے ساری رات ہی غارت کرا دی۔ اس سے تو اچھا تھا میں وہاں چلا جاتا۔ میریڈن میں ڈانس پارٹی تھی آج۔''

''اب بھی چلے جاؤ، وہ پارٹی تو ساری رات چلے گی۔''

''جاتے جاتے دو ڈھائی بج جائیں گے..... کیا فائدہ؟'' اس نے شکایت بھری نظروں سے مجھے دیکھا۔

اور میں نے اتنا چکنا گھڑا پہلی بار دیکھا تھا، کوئی وقتی طور پر تو شرمندہ ہو جاتا ہے۔ پھر وہ ایسے ہو گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ وہ اصرار کرنے لگا کہ اب کے آپ لوگ ادھر آئیں تو ہماری طرف ضرور آئیں، ہمیں پتہ چلتا رہتا ہے کہ آپ پاس پڑوس میں آتے ہیں مگر ہماری طرف نہیں آتے۔

''وقت ہی کم ہوتا ہے۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''تو ٹھیک ہے، آپ جہاں بھی آئیں مجھے فون کر دیں، میں وہیں آ جاؤں گا۔''

ہم اب جب کبھی کبھار سجاد بھائی کے ہاں جاتے ہیں یا عید ڈنر اور پاکستانی تقریبات میں جاتے ہیں تو شکیل سے بھی ملنا ہوتا ہے۔ جب وہ حیرت سے آنکھیں پھیلا کر تعریفی انداز میں دیکھتا ہے تو اپنی پارسائی کے تمام تر دعووں کے باوجود میری مسکراہٹ میں خود بخود شہد گھل جاتا ہے، گالوں پر گلاب کھل اٹھتے ہیں، آنکھوں میں ستارے اتر آتے ہیں لیکن چال میں ایک پروقار اور پر اعتماد تمکنت پیدا ہو جاتی ہے۔

پناہ گاہ

خط کے آخری لفظ میں نے ٹائپ کیے۔ ''ہمیشہ سے تمہارا پجاری'' اور ایک لمبی سانس لی۔ میں نے خط کو دوبارہ پڑھا۔ چھوٹی موٹی غلطیاں درست کیں، احتیاط سے تہہ کیا اور عطر میں بسے ہوئے خوبصورت لفافے میں ڈال کر بند کر دیا اور فون پر آرڈر کرنے کے بجائے خود پھولوں کی دکان کے لیے روانہ ہوگئی۔

آج پھر ویلین ٹائن ڈے ہے۔ وہ دن جب ہر محبّ اپنے محبوب سے اظہار محبت کرتا ہے۔ دور دراز بچھڑے، پرانے، شاد کام، ناکام بھی اپنے احساسات کسی نہ کسی طرح اس دن اپنے محبوب تک پہنچاتے ہیں اور یہ اظہار روایتاً پھولوں کی شکل میں ہوتا ہے۔ میں آج سیلی کو پھولوں کے ساتھ یہ محبت نامہ پہلی بار بھیج رہی ہوں۔

سیلی میری دوست ہے بہت پرانی اور بہت اچھی۔ ہم لوگ یونیورسٹی میں ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ سیلی جاپانی نژاد لڑکی تھی۔ اس کا اصلی نام تو کچھ اور تھا جو صرف کاغذات میں استعمال ہوتا تھا۔ باقی ہر ایک کے لیے وہ سیلی تھی، اس کے گھر والے بھی اسے اسی نام سے پکارتے تھے۔ ہماری صرف ایک کلاس مشترک تھی لیکن مزاج میں بہت سی باتیں مشترک تھیں اس لیے ہم جلد ہی بہت اچھے دوست بن گئے۔

سیلی کی جو بات مجھے سب سے زیادہ پسند تھی کہ وہ میری ذہنی کیفیات کے ساتھ ساتھ

چلتی تھی۔فوراً سمجھ جاتی اور پھر وہ بات اس انداز میں کرتی کہ جیسے خود اس کی یہی مرضی ہے ان دنوں میں بے انتہا مصروف رہتی تھی پڑھنے کا شوق مجھے جنوں کی حد تک تھا اس ہوکے میں اتنی کلاسیں اتنے کورسز لے لیتی کہ کئی کئی راتیں سونا نصیب نہ ہوتا۔ سیلی کے ساتھ میں لنچ، ڈنر یا کافی کا پروگرام بنا لیتی مگر پھر تھکن یا مصروفیت کی وجہ سے موڈ نہ بنتا۔ میں اسے فون کرتی اور ابھی خیر خیریت دریافت کرنے کی گفتگو چل رہی ہوتی کہ وہ میرے انداز اور لہجے سے پہچان جاتی۔

''سنو روحی! ڈنر پہ آج ہی چلیں یا کوئی اور دن رکھ لیں۔'' سیلی کہتی، میرے من کی مراد بر آتی۔

''کیوں......کوئی مصروفیت ہے کیا؟'' میں سوال کرتی۔

''بس ذرا طبیعت سست ہے لیکن اگر تمہارا موڈ ہے تو چلی چلوں گی۔'' سیلی کہتی۔

میرے دل کے کسی کونے میں احساس جرم کسمناتا۔''اچھا، کل چلتے ہیں۔'' میں جیسے خود کو تسلی دیتی۔

''کوئی جلدی نہیں آرام سے پروگرام بنا کر فون کر دینا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میرے ذہن سے بوجھ اتر جاتا پھر بھی شک سا رہتا کہ کہیں اس نے میری خاطر نہ کہہ دیا ہو۔

''مجھے افسوس ہے میں نے پروگرام خراب کیا۔'' وہ کہتی۔

''نہیں نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔'' اور میں مکمل طور پر پُرسکون ہو جاتی۔

''شکریہ روحی!'' وہ کہتی اور میں اطمینان کے لمبے سانس کے ساتھ خدا کا شکر ادا کرتی کہ آخرکار مجھے ایسی اچھی دوست مل ہی گئی۔

اس سے پہلے میری وقتاً فوقتاً کئی سہیلیاں رہیں لیکن مشترکہ دلچسپیوں کے باوجود نبھ نہ سکیں۔ وہ میری کسی مجبوری کو نہ سمجھتیں اور مسلسل تفریحات کے پروگرام بناتی رہتیں جیسا کہ اس عمر میں یہی باتیں حاصل حیات لگتی ہیں۔ میں اپنے ٹائم ٹیبل میں سے زبردستی وقت نکال کر شامل ہوتی جس کا نتیجہ کچھ اور رت جگے ہوتے مگر پھر بھی اگر کوئی ایک آدھ پروگرام خراب ہو جاتا تو وہ ناراض ہو جاتیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ ہم میں دوری ہو جاتی اور تب مجھے سیلی جیسی

نعمت عظمیٰ مل گئی کہ آخر مجھے اپنی مسلسل مصروفیت میں سے اعصاب کو سکون دینے کے لیے تھوڑی بہت تفریح تو چاہیے تھی اور ایک اچھی دوست بھی جس کے ساتھ لطف اندوز ہوا جا سکے۔ میں تو خیر ناکوں تاک اپنی تعلیمی سرگرمیوں میں ڈوبی ہوئی تھی اور ویسے بھی ہمارے مذہب اور کلچر کی رو سے کسی بوائے فرینڈ کا سوال ہی نہیں تھا۔ مگر اتفاق سے سیلی کا بھی کوئی بوائے فرینڈ نہیں تھا۔ اسے میرا ساتھ یوں بھی پسند تھا کہ دوسری لڑکیاں اس کے بوائے فرینڈ نہ ہونے پر اتنی حیرت کا اظہار کرتیں کہ وہ احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتی۔ میرے ساتھ اسے تحفظ کا احساس ہوتا۔ یہ بات اس کے لیے باعث تسکین تھی کہ اکیلی وہی ایسی نہیں ہے روحی جیسی خوبصورت لڑکی جس کے بہت سے مداح ہیں اس کا بھی کوئی بوائے فرینڈ نہیں ہے۔

میرا تو خیال ہے کہ میں مناسب شکل وصورت کی عام سی لڑکی ہوں۔ لباس کا میں اتنا اہتمام ضرور کرتی ہوں کہ وہ ہر لحاظ سے معقول اور باوقار ہو اور بس۔ میں نے یونیورسٹی کی اکثر لڑکیوں کی طرح بناؤ سنگھار پر کبھی توجہ نہیں دی اور کیا لڑکیاں کیا لڑکے ہر ایک سے ایک فاصلے پر رہی۔ لیکن اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ میں بہت خوبصورت ہوں خصوصاً میری آنکھیں اور بال...... اور یہ کہ میں بہت منفرد اور باوقار ہوں۔ ممکن ہے اس کی وجہ صرف فاصلہ اور دوری ہو۔ تعریفی انداز سے تو سبھی لڑکے دیکھتے لیکن وقتاً فوقتاً کچھ نے گہری دلچسپی اور محبت کا اظہار کیا مگر میں نے ہر ایک سے معذرت کر لی۔ ظاہر ہے یہ دور ہر لڑکی کی زندگی میں آتا ہے اور ایسے چھوٹے چھوٹے خوبصورت راز ہر لڑکی سینے میں لیے پھرتی ہے۔ ایسی باتیں ماؤں سے کرنے کی تو ہوتی نہیں۔ بہن میری کوئی تھی نہیں سو میں یہ ساری باتیں سیلی کو بتاتی۔ ابتدا میں تو میں اسے اپنا وہم سمجھی مگر پھر میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ یہ سب سنتے ہوئے اس کے چہرے پر عجیب سی محرومی کی دھند چھا جاتی۔

سیلی ایک دبلی پتلی نازک اندام، خوش شکل، خوش طبع اور نیک سیرت لڑکی تھی اس کے مزاج میں ایک وقار تھا وہ چاہتی تو کئی بوائے فرینڈ بنا سکتی تھی لیکن اس نے خود کبھی پہل نہ کی اور یہ بات میں آج تک نہیں سمجھ سکی کہ خود کسی لڑکے نے سیلی کی ذات میں دلچسپی کیوں نہ لی۔ اگر وہ ایشین تھی تو میں بھی ایشین تھی۔ وہ تو پھر ایک ترقی یافتہ ملک سے تعلق رکھتی تھی۔ میں تو ایک پسماندہ اور غریب ملک کی شہری تھی اگر مجھے اتنی توجہ مل سکتی تھی تو اسے کیوں نظر

انداز کیا گیا۔

مجھے اپنی سالگرہ پر کئی گمنام کارڈ اور پھول ملتے اور ویلنٹائن پر بعض اوقات اتنے مہنگے اور خوبصورت پھول آتے کہ تھوڑی دیر کے لیے تو میں بھی اس شخص کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو جاتی جو چاہے گمنام سہی مگر خود کو اظہار سے نہیں روک سکا۔ لاکھ مذہب اور کلچر نے شروع ہی سے جذبات پر پہرے بٹھانے سکھا دیئے تھے لیکن یہ خیال دل کو گدگداتا تو تھا کہ کچھ لوگ میرے لیے اتنے گہرے جذبات رکھتے ہیں انا کی تسکین کے ساتھ ساتھ مسرت کی ایک لہر رگ و پے میں دوڑ جاتی۔ میں اپنے اس فخر و انبساط میں سیلی کو شریک کرتی تو مجھے یہ جان کر دکھ ہوتا کہ سیلی کو یہ عشرت کبھی میسر نہیں آئی اس کی انا کو کتنی ٹھیس پہنچتی ہوگی جب میں اسے یہ سب بتاتی ہوں۔ وہ چاہتی تو اور لڑکیوں کی طرح ایک کی دو بنا کر یا اپنے پاس سے کہانیاں گھڑ کر جھوٹ بھی بول سکتی تھی مگر وہ سچی لڑکی تھی اس لیے اس نے ایسا کبھی نہیں کیا۔ بلکہ بڑی معصومیت سے کہتی۔ ''مجھے معلوم ہے مجھے کوئی پسند نہیں کرتا۔'' مجھے بہت رنج ہوتا۔

تب ہی میں نے وہ خوبصورت شرارت کی جو بعد میں ریت بن گئی۔ یہ یونیورسٹی میں ہمارا دوسرا سال تھا اور ہماری دوستی کو اتنی ہی مدت گزری تھی تب اس ویلنٹائن ڈے پر میں نے سیلی کو چند پھول بھیجے، گمنام...... صرف ان لفظوں کے ساتھ ''تمہارا مداح''

پھول وصول کرتے ہی سیلی نے مجھے فون کیا۔ ''تم نے مجھے پھول بھیجے ہیں؟''

''نہیں، میں کیوں بھیجوں گی۔''

''سچ بتاؤ۔'' اس نے بے یقینی سے کہا۔

''کیا واقعی تمہارا خیال ہے کہ میری جنس بدل گئی ہے؟''

ہم دونوں ہنسنے لگیں اور اسے یقین آ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ میرے گھر پہ تھی اور ہم دونوں مل کر اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہ کون ہو سکتا ہے۔ اس روز وہ بہت خوش تھی اور اس کی خوشی دیکھتے ہوئے میں نے یہ ریت بنالی۔ یہ میری جیب پر منحصر ہوتا کہ اس وقت میرے پاس کتنے پیسے ہیں اس کے مطابق کبھی کم اور کبھی زیادہ پھول اسے بھیجتی۔ اب اسے مجھ پر شک نہیں تھا۔ میں اسے بتاتی کہ اب میرے پاس آنے والے پھولوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے شاید مایوس ہو کر چھوڑتے جا رہے ہیں۔ مگر وہ بڑی شوخ مسکراہٹ سے کہتی۔ ''میں

تو کہتی ہوں کہ چاہنے والا چاہے ایک ہو مگر ہو ہمیشہ چاہنے والا۔"

"تمہارا چاہنے والا تو سادھوسنت لگتا ہے۔ اتنا بے غرض کون ہے آج کل کے زمانے میں؟"

اور اس کی چمپئی رنگت میں گلاب کھل جاتے اور چھوٹی چھوٹی آنکھیں بالکل ہی غائب ہو جاتیں۔

ہم نے تعلیم مکمل کر لی۔ اسے دوسرے شہر میں نوکری مل گئی۔ ہمارا ای میل سے رابطہ رہا۔ کبھی کبھار فون بھی کر لیتے۔ وقت کا پہیہ گھومتا رہا۔ دن مہینوں اور سالوں میں بدلتے گئے۔ مصروفیتیں بدلتی گئیں۔ سیلی جیسی دوست تو پھر مجھے زندگی بھر نہ ملی۔ اس لیے وہ ہمیشہ مجھے یاد رہی۔ اگرچہ رابطہ پہلے سے کم ہو گیا مگر ویلن ٹائن کے پھولوں کی روایت میں نے قائم رکھی۔

پھر کچھ سالوں بعد جب میں نے محسوس کیا کہ اب میں عملی زندگی میں قدم رکھ سکتی ہوں تو میں نے والدین کی بات مان لی اور شادی کے لیے رضامندی ظاہر کر دی۔ میرے والدین کی رہنمائی میرے ساتھ تھی انہوں نے کاشف کو مجھ سے ملوایا اور ایک دو ملاقاتوں ہی میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ ان کا انتخاب صحیح ہے۔ میری منگنی ہو گئی۔ میں نے سیلی کو بتایا اور مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ سیلی کا ایک کولیگ اس میں دلچسپی لے رہا ہے۔

کچھ مہینوں بعد میری شادی ہو گئی۔ سیلی میری شادی پر آئی۔ اب وہ پہلے سے زیادہ پراعتماد اور خوش تھی۔ ایک سچ مچ کے جیتے جاگتے شخص کی محبت نے اس کی زندگی میں رنگ بھر دیے تھے۔

"سیلی! اب تم بھی شادی کر لو۔" میں نے مشورہ دیا۔

"ہاں، اگر اس نے پیشکش کی تو انکار نہیں کروں گی۔"

اور میں دعا کرنے لگی کہ اللہ کرے وہ کر ہی دے ورنہ کوئی اور شوہر ڈھونڈنا سیلی جیسی سیدھی لڑکی کے بس کا روگ نہیں تھا اور نہ ہی وہ ایسی لڑکی تھی کہ بغیر شادی کے سارے لطف اٹھا کر آزادانہ زندگی گزارتی۔ اگرچہ اس نے شعوری طور پر اخلاقی اصول نہیں اپنائے تھے مگر اس میں بڑی مشرقیت اور تقدس تھا۔

ہم ہنی مون سے لوٹے تو سیلی کی شادی کا کارڈ ڈاک میں آیا رکھا تھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ

میں سیلی کی شادی میں نہیں جا سکی تھی۔ کیف و مستی اور بے خودی کے ان دنوں میں میں نے گھر رابطہ کیا ہی نہیں تھا۔ سوچا تھا چند ہفتوں کی تو بات ہے۔ ورنہ مجھے پتہ چل جاتا اور میں سیلی کی شادی پر ضرور جاتی۔ بہر حال مجھے بہت خوشی ہوئی۔ میں نے رابطہ کیا تو پتہ چلا کہ سیلی اور روجر ہنی مون پر گئے ہوئے ہیں۔

میرا پتہ تبدیل ہو گیا تھا اس لیے میرے لیے آنے والے پھولوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا، مگر میں چونکہ سیلی کے پتے کی تبدیلی سے آگاہ رہتی تھی، اس لیے میں پھول بھیجتی رہی۔

پھر روزی روزگار کے سلسلے میں ہم دوسرے ملک چلے گئے۔ زندگی میں اور بھی کئی اہم تبدیلیاں آئیں۔ میں دو بچوں کی ماں بن گئی۔ زندگی زیادہ مصروف ہو گئی اور اس سارے سلسلے میں، میں سیلی سے رابطہ کھو بیٹھی۔ مگر اس کی یاد برابر آتی رہتی۔

پھر ویلن ٹائن ڈے آیا۔ اتفاق سے کاشف شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ مجھے صبح ہی صبح ان کی طرف سے پھول ملے تو دفعتاً سیلی کو پھول بھیجنے کا خیال آیا۔ وہ مجھے بے طرح سے یاد آئی۔ مجھے خود پر بہت غصہ آیا کہ کیا سیلی جیسی دوست بھی ایسی چیز تھی کہ انسان اس سے رابطہ چھوڑ بیٹھے اور مجھے اس کی دوستی میں گزارا ہوا ایک ایک پل یاد آنے لگا۔

میں ان دنوں بہت پریشان تھی۔ اپنے ہوکے میں میں نے ٹرپل میجر رکھ لیا تھا ایک مائنر کورس اس کے علاوہ تھا اس پر طرہ غیر نصابی سرگرمیاں۔ لیکن اب چوتھے سال میں میں ان سب چیزوں کو کسی طرح بھی نبھا نہیں پا رہی تھی۔ کئی پیپر مطلوب تھے۔ ڈیڈ لائنز بوکھلائے دے رہی تھیں۔ عدم تکمیل کے احساس نے مجھے بری طرح گھیر لیا اور میرا خود پر یقین متزلزل ہو گیا اور میں بجائے چیزوں کو مرتب کرنے اور ان سے عہدہ برآ ہونے کے حوصلہ چھوڑ بیٹھی اور شدید ڈیپریشن کی کیفیت میں مجھے سوائے خودکشی کے کچھ نہیں سوجھ رہا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ مجھ میں کچھ بھی کرنے کی صلاحیت سرے سے مفقود ہے اور ان دنوں جبکہ سب لوگ فائنلز کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے۔ میں کتابوں کو بند کر کے صرف خودکشی کے مختلف طریقوں پر غور کرتی رہتی۔ شروع میں تو مجھے ماں باپ، بہن بھائیوں کے اس دکھ کا احساس ہوتا جو انہیں مجھے کھو دینے کی صورت میں برداشت کرنا پڑتا۔ مگر پھر شدید ذہنی تناؤ میں میں ہر احساس سے عاری ہوتی گئی۔ میں نے باہر آنا جانا تو درکنار بغیر کسی شدید ضرورت کے کمرے سے بھی نکلنا

بند کر دیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ بولنا چالنا بھی ترک کر دیا۔ اپنے لیے آنے والے فون تک نہ سنتی۔ گھر والے میری اس حالت سے پریشان تھے مگر وجہ کسی کو معلوم نہ تھی۔ اس دوران سیلی کا کئی بار فون آیا مگر میں نے بات نہ کی۔ میں چونکہ اس عدم تکمیل کو اپنی کمزوری اور شکست سمجھ رہی تھی، اس لیے اس کا کسی سے ذکر نہیں کرنا چاہتی تھی، سیلی سے بھی نہیں۔ اور غالباً اسی لیے میرا اعصابی تناؤ بڑھتا گیا اور میں عجیب طرح کے جمود کا شکار ہو گئی۔ کچھ نہ جانتے ہوئے بھی سیلی بجائے ناراض ہونے کے معاملے کی نزاکت کو بھانپ گئی۔ اس نے مجھے ای میل بھیجی جس کا پرنٹ آج بھی میرے پاس محفوظ ہے اور جس کا ہر لفظ میرے دل پر کندہ ہے۔ اس نے لکھا تھا:

''تمہیں معلوم ہے کبھی کبھی کیا ہوتا ہے، وہ خوبصورت صندوق جسے ہم کئی ناپسندیدہ اور فالتو چیزوں سے ٹھسا ٹھس بھر کر ایک طرف رکھ دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم ان سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں، ایک جھٹکے سے کھل جاتا ہے اور ساری ناپسندیدہ چیزوں کو واپس ہمارے منہ پر دے مارتا ہے۔ اب یا تو ہم انہیں دوبارہ اسی طرح ٹھونسنے کی کوشش کریں یا پھر ان کو صحیح کر کے تہہ جما کر رکھیں تاکہ وہ دوبارہ نہ ابل پڑیں۔ اس طرح کرنے میں بے شک ان کی بدصورتی کو زیادہ دیر تک برداشت کرنا پڑے گا۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ہم ہر ایک چیز کو درست کر لیں لیکن کم از کم کچھ کو تو ضرور قاعدے سے درست کر لیں گے اور اسی طرح آہستہ آہستہ شاید سب کو۔ ہو سکتا ہے میں ان بکھری ہوئی ناپسندیدہ چیزوں کو درست کر کے صندوق بند کرنے میں تمہاری کوئی مدد نہ کر سکوں۔ لیکن میں تم سے پیار کرتی ہوں بہت زیادہ۔ میرا پیار یقیناً تمہیں اس جنگ کو لڑنے میں توانائی دے گا جس طرح تم میری ذات کا ایک حصہ بن کر میرے اندر موجود ہو۔ مجھے امید ہے کہ اسی طرح تم بھی میری ذات کا کچھ نہ کچھ حصہ اپنے اندر پاؤ گی۔ میں بس اتنا چاہتی ہوں کہ جب تم کوئی مشکل چڑھائی چڑھنے لگو یا کسی ویران صحرا سے گزرنے لگو تو مجھے ایک دوست کی طرح ہاتھ تھام کر ساتھ چلنے دو۔

میں تمہارے متعلق سب کچھ نہیں جانتی لیکن تمہیں جانتی ہوں اگر مجھے کہا جائے کہ میں تمہارے متعلق ہر بات جان لینے اور صرف تمہیں جاننے میں سے ایک چیز کو منتخب کروں تو میں موخر الذکر کو ترجیح دوں گی۔ اگر تم اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے کچھ کہنا چاہو تو میں سننے کو

موجود ہوں اور اگر نہ چاہو تو میں اصرار نہیں کروں گی۔ جب تم سمجھتی ہو کہ تم اپنا آپ چھپانے میں کامیاب ہوگئی ہو تو بھی تمہارے اردگرد چھائی ہوئی دھند میں سے تمہاری اصلی چمک جھلک جاتی ہے۔ ایسی باتیں ضرور اہم ہوتی ہیں لیکن میرے لیے کچھ بھی اس لڑکی سے زیادہ اہم نہیں ہے جس کا نام روحی ہے۔ اگر تم یہ سمجھو کہ میں یہ سب باتیں تمہیں بہلانے کے لیے کہہ رہی ہوں تو یہ میرے جذبات کی توہین ہوگی۔ شاید میں اپنے الفاظ بلکہ عمل سے بھی ان احساسات کا مکمل طور پر اظہار نہ کر پاؤں جو تمہارے لیے میرے دل میں ہیں۔

''شاید تمہیں اچھا نہ لگے لیکن مجھے کہنے دو کہ تم نے اپنے آپ کو ایک تاریک غار میں تنہا قید کر لیا ہے۔ نہیں، بلکہ تم شیشے کے ایک بند کمرے میں رو رہی ہو جس میں سے تم سب کچھ دیکھ رہی ہو لیکن کسی کو خود تک پہنچنے نہیں دے رہی ہو۔ ممکن ہے بظاہر ہم ہزار طریقوں میں ایک دوسرے سے مختلف ہوں لیکن اتنا جان لو کہ تم اپنی ذات کے باہر بھی کسی میں موجود ہو۔''

''مجھے بتانا کہ تم کب میرے ساتھ چلنا چاہو گی ...... ڈنر کے لیے، کافی کے لیے یا قبرستان؟''

چائے اور کافی کے ساتھ قبرستان کی پیشکش اتنی دلچسپ اور مزاحیہ لگی کہ میں یہ سوچ کر مسکرانے لگی کہ کوئی اور پڑھے تو کبھی نہ سمجھ سکے اور الٹا وہ سیلی کی دماغی حالت پر شک کرے۔ مجھے خود بخود ہنسی آ گئی اور بے حسی کا وہ جمود ٹوٹ گیا جو طاری تھا اور سیلی کی ساری باتیں میری سمجھ میں آ گئیں۔

مڑ کے دیکھو تو یادوں کے خزانے میں جگمگاتے ہوئے ہیرے جواہرات چاہے لمحاتی طور پر ہی سہی کیسی کیسی معصوم جادو بھری فضا چاروں طرف تان دیتے ہیں۔ عمر کے ہر دور کے اپنے اپنے رنگ اور کیفیات ہوتی ہیں۔ کیسی کیسی چیزیں مسحور کرتی ہیں انسان کو۔ ان دنوں میری دو پسندیدہ جگہیں تھیں۔ ایک لائبریری اور دوسری قبرستان۔

میں لائبریری جاتی تو مجھ پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو جاتی۔ تب وہ کتابیں، کتابیں نہ رہتیں زندہ دانشور ہو جاتے اور میں فخر و انبساط سے پھولے نہ سماتی کہ میں اتنے عظیم دانشوروں کے درمیان میں ہوں۔ وہ اپنی فہم و فراست میں سے مجھے حصہ دے رہے ہیں اپنے تجربات کا نچوڑ مجھے سنا رہے ہیں میں ان کے ساتھ تبادلہ خیالات کر رہی ہوں اور مجھے وقت

گزرنے کا کوئی احساس نہ ہوتا۔ اور جب چوکیدار روشنیاں بجھانے آتا تو مجھے مجبوراً اُن کی صحبت سے نکلنا پڑتا۔

لائبریری کے بعد میری دوسری پسندیدہ جگہ قبرستان تھی۔ پہلی بار تو مجھے جس چیز نے متوجہ کیا وہ ایک قبر کے اوپر بنا ہوا ایک مجسمہ تھا اور پھر تو اس شہرِ خموشاں کے حُسن نے مجھے اسیر کر لیا۔ کچھ قبروں کے تعویذوں کے اوپر آرٹ کے نادر نمونے بنے ہوتے۔ کچھ کے اردگرد پھول اُگے ہوتے اور کچھ پر کچھ بھی نہیں۔

میں سب کے نام اور عمریں پڑھ کر ان کے خیالی پیکر تراشتی۔ قبرستان کے بیچوں بیچ موٹی موٹی شاخوں والا ایک پست قد درخت تھا جس پر پتے تو برائے نام تھے لیکن جڑوں نے مٹی کے ساتھ رشتہ استوار رکھا تھا۔ میں اس سال خوردہ درخت کے موٹے ٹہنے پر بیٹھ جاتی اور سوچتی رہتی کہ ضرور ان پھولوں اور مجسموں والی قبروں والے پسماندگان انہیں زیادہ چاہتے ہوں گے۔ ممکن ہے سادہ قبروں والوں میں سے بھی کچھ ایسے ہی چاہنے والے ہوں مگر ان کے پاس اتنے پیسے نہ ہوں اور پھر میں نے چپکے چپکے ڈرتے ڈرتے کچھ قبروں کے اردگرد پھولوں کے بیج بو دیے۔ پھر سیلی میرے ساتھ آنے لگی تو ہم دونوں درخت کی شاخ پر ساتھ ساتھ بیٹھے دنیا جہاں کی باتیں کیے جاتیں۔ سڑک پر سے گزرتی ہوئی کاروں کو دیکھتے پیدل چلنے والوں پر طرح طرح کی رائے زنی کرتیں مزے مزے کے فقرے چست کرتیں اور ہنستے رہتے اس طرح ہم کچھ وقت ان لوگوں کی صحبت میں گزارتے جو کبھی ہماری طرح ہنستے مسکراتے تھے۔ چلتے وقت ہم چپکے سے کچھ اچھے اچھے پھول توڑ لیتیں۔ سیلی پھول توڑتے وقت معذرت کرتی۔

''کوئی بات نہیں، ہم آپ کو ملنے بھی تو آتے ہیں۔ اتنا تو ہمارا حق بنتا ہے۔''

گھر لا کر ہم وہ پھول اپنے اپنے گلدانوں میں سجا لیتے۔

اس لیے سیلی نے ڈنر اور کافی کے ساتھ قبرستان کی بھی دعوت دی تھی۔ کیونکہ وہ ہم دونوں کی مشترکہ پسندیدہ ملاقات کی جگہ تھی۔ پھر سیلی کچھ عرصے کے لیے ڈورم میں منتقل ہو گئی۔ میرے لیے تو جیسے دوسرا گھر بن گیا۔ میں اکثر افراتفری میں بغیر کھائے پیے نکل جاتی۔ سیلی سینڈوچ بنا لیتی۔ کلاسیں ختم ہوتے ہی میں لائبریری میں جا گھستی وہ مجھے وہاں بھی آ پکڑتی۔

''بس پانچ منٹ کے لیے باہر آ جاؤ۔'' وہ منت کرتی۔

''میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔'' میں رکھائی سے کہتی۔

''بس صرف پانچ منٹ۔'' وہ اصرار کرتی۔

میں زچ ہو کر باہر نکل آتی وہ وہیں زمین پر بیٹھ کر تھیلے میں سے سینڈوچ، دودھ یا جوس نکالتی اور ساتھ ہی ساتھ متوازن غذا کی ضرورت اور نہ لینے کے نقصانات ماؤں کی طرح سمجھاتی رہتی۔

وہ اس کے چھوٹے چھوٹے معصوم تحفے، جو وہ اپنے محدود جیب خرچ میں سے پیسے بچا کر خریدتی۔ رنگ برنگ ٹافیاں خوبصورت چاکلیٹ وغیرہ۔ اسے کارڈ پسند آتے تو ایک ساتھ کئی کارڈ خرید لیتی اور پھر لفافہ در لفافہ سارے کارڈ ایک بار ہی بھیج دیتی۔ ڈائری تحفے میں دیتی تو طرح طرح کی باتوں سے آدھی ڈائری تقریباً وہی لکھ ڈالتی۔ ایسی دوست بھی بھلا بھلانے کی چیز تھی۔ بھلایا تو خیر اسے کسی صورت نہیں جا سکتا تھا۔ اس نے خود ہی تو کہا تھا کہ اس کی ذات کا ایک حصہ میرے اندر ہے وہ اپنے مقام سے باخبر تھی۔ مگر یہ جو تقریباً سال بھر سے ہم ایک دوسرے سے کٹ گئے ہیں، اس کا کیا ہوگا۔ کیا ہم دوبارہ کبھی ایک دوسرے کو ڈھونڈ بھی پائیں گے کہ نہیں؟ یا خدا کوئی معجزہ کر دے کہ اچانک ہی سیلی مجھے مل جائے۔

ائیر پورٹ پر، سٹیشن پر، بس میں، گاڑی میں، کسی موڑ پر، کسی سڑک پر، کسی ریستوران میں...... میں نے آنکھیں بند کر کے پورے خلوص سے دعا مانگی۔ مگر برسوں پرانی ریت تو ٹوٹ گئی نا، پھول تو نہیں ملیں گے سیلی کو اس بار۔

اور پھر سچ مچ معجزہ ہو گیا۔ میں ایک میوزک شو کے ٹکٹ لینے کے لیے لائن میں کھڑی تھی۔ مجھ سے دو نمبر آگے کھڑی خاتون نے مڑ کر دیکھا تو میں چونکی۔ میں نے بے یقینی سے مدھم سی آواز میں کہا۔ ''سیلی!''

اس نے مڑ کر دیکھا اور ہم لائن سے نکل کر ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔ گزرے ہوئے دس سال ہمارے درمیان سے ہوا کے جھونکے کی طرح اُڑ گئے اور ہمیں لگا کہ ہم کل ہی تو ملی تھیں۔

ان دس سالوں نے غالباً سیلی کے ساتھ کوئی زیادہ اچھا سلوک نہیں کیا تھا وہ کافی معمر

دکھائی دے رہی تھی حالانکہ جاپانیوں کی عمر چوری تو مشہور ہے۔

''تم...... تم کتنی شاندار ہو گئی ہو، پہلے سے بھی زیادہ۔ لگتا ہے وقت کا پہیہ الٹی طرف گھوما ہے تمہارے لیے۔''

ہم ایک دوسرے میں ایسے کھوئے کہ پوری لائن ختم ہو گئی تو کاؤنٹر کلرک نے پکارا۔

''یس میڈم!''

''کانسرٹ کے بعد گھر چلیں گے نا سلی!'' میں نے ٹکٹ کے لیے کاؤنٹر کے سامنے کھڑے ہوئے پوچھا۔

''نہیں روحی! میری تو تین گھنٹے بعد فلائٹ ہے۔ میں یہاں کانفرنس میں آئی تھی۔ فلائٹ میں کچھ ٹائم تھا تو میں بجائے ایئر پورٹ پر بیٹھنے یا ادھر ادھر بھٹکنے کے وقت کاٹنے یہاں آ گئی۔''

ہم کانسرٹ کے بجائے قریبی ریستوراں میں جا بیٹھے۔ ہم ایک دوسرے سے دس سالوں کی داستان ایک منٹ میں سننے کو بیتاب تھے۔

''کیسی ہو؟ گزر بسر کیسے ہو رہی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''مڈل کلاس لائف آرام سے چل رہی ہے۔''

''اور تمہاری؟'' اس نے جواباً پوچھا حالانکہ اسے تو اس کا کوئی تجسس دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

''روٹی روزی ٹھیک چل رہی ہے۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ اپنی خوشحالی کا کوئی ذکر نہ کیا۔

''تمہارا شوہر تمہیں چاہتا ہے؟'' اس نے اچانک پوچھا۔

میں گڑبڑا گئی۔ مجھے کیا کہنا چاہیے۔ فوری طور پر کچھ نہ سوجھا تو الٹا سوال کر دیا۔

''کیا تمہارا شوہر تمہیں چاہتا ہے؟''

''میرا خیال ہے، نہیں۔'' اس نے بالکل سپاٹ لہجے میں کہا۔

کوئی دکھ، کوئی غم اس کی آواز میں شامل نہیں تھا۔

''شادی سے پہلے اس نے کچھ محنت کی۔ وہ شاید محبت کرنا جانتا ہی نہیں۔ اس جذبے کی

گہرائی سے واقف ہی نہیں۔ اسے زندگی گزارنے کے لیے ایک معقول ساتھی چاہیے تھا اور بس!......اور......اور......شاید مجھے بھی۔ لیکن میں کبھی کبھی بری طرح اکتا جاتی ہوں کوئی فائدہ ہے اس ساتھ کا۔"

میں خاموش رہی۔ اور پھر میرے متعلق کچھ پوچھنے یا اپنے سوال کا جواب لینے کا اسے خیال ہی نہ رہا۔ وہ کھوئی کھوئی سی بولتی چلی گئی۔

"مگر مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ میں جانتی ہوں کہ ایک دل ہے جو صرف میرے لیے دھڑکتا ہے ایک ذہن ہے جو صرف میرے لیے سوچتا ہے۔ میں جب بھی چاہتی ہوں آنکھیں بند کر کے ان گلپوش وادیوں میں جا نکلتی ہوں جہاں کوئی میرے پیار کے گیت گا رہا ہے، صرف میرے لیے......اس لیے میرے دل میں کوئی خلا نہیں ہے۔"

"کون ہے وہ......تم نے کبھی بتایا نہیں۔"

"تمہیں معلوم تو ہے، وہی ویلن ٹائن ڈے پر پھول بھیجنے والا میرا گمنام پرستار۔"

میں چونکی۔

"مگر اس سال مجھے پھول نہیں ملے۔ یقیناً ڈاک میں کہیں گڑبڑ ہو گئی ہے ورنہ بارہ سال میں کبھی ایسا نہیں ہوا۔"

"مر کھپ گئے ہوں گے کہیں بزرگوار۔" میں نے مذاقاً کہا۔

"نہیں!" وہ تقریباً چیخ پڑی۔ "تم اتنی بے حس کب سے ہو گئیں روحی! میری عمر بھی اسے لگ جائے اور تم یہ بڑے میاں اور بزرگوار کیسے کہہ رہی ہو نہیں؟" اس نے بڑے دکھ سے کہا۔

"میں تو تمہیں چھیڑ رہی تھی سیلی! ویسے تم نے بھی تو اسے نہیں دیکھا۔" میں نے معذرت کی۔

"دیکھا ہے میں نے......میں نے اسے دیکھا ہے۔" وہ جیسے خواب کے عالم میں بولی۔ اور پھر اس کا حلیہ بیان کرنے لگی جو یقیناً اس کے تخیلاتی مرد کا تھا۔

"ملا تھا تمہیں؟" مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

"نہیں!" وہ جیسے خواب سے بیدار ہو گئی۔ "مگر وہ یقیناً ایسا ہی ہو گا، مجھے معلوم ہے۔"

وہ مسکرائی۔

''روحی! میں یہ تو نہیں جانتی کہ اس نے ہمیشہ گمنام رہنا کیوں پسند کیا لیکن اگر اس شخص کی چاہت میرا اسہارا نہ بنی رہتی تو زندگی کتنی مشکل، کتنی خالی ہوتی۔''

یہ سب کہہ دینے کے بعد وہ جیسے ہلکی پھلکی ہوگئی۔

''اب تم بھی کچھ بتاؤ، تمہارے تو بہت پرستار تھے۔''

''وہ فصلی پرندے تو کبھی اڑ گئے تھے ایک ایک کر کے۔''

''دیکھا، میں ٹھیک کہتی تھی نا کہ بہت سے پرستاروں کے بجائے ایک مگر ہمیشہ چاہنے والا بہتر ہے۔''

''ہاں!'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''اور تمہارا شوہر تمہیں چاہتا ہے؟'' اسے اپنا سوال یاد آ گیا۔

''اسے بھی ایک ساتھی چاہیے تھا اور مجھے بھی۔'' میں نے اسی کے الفاظ دہرائے۔ میں اسے کسی احساس کمتری میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''اور تمہارے بچے اُتنے ہی ہیں یا اضافہ کر لیا ہے۔'' وہ ہنسی۔

''وہی دو ہیں۔ مگر تم اچھی رہیں۔ بچہ تو ایک ہی ٹھیک ہوتا ہے۔ جتنے بچے، اتنی ذمہ داری۔''

''مگر تمہارا رنگ روپ اور صحت دیکھ کر میں تو کچھ اور ہی سمجھی تھی۔'' وہ افسردہ ہوگئی۔

''اس لیے کہ میں ہر بات کو جان کا روگ نہیں بناتی۔ میں اپنے لیے زندہ ہوں اور بہت خوش ہوں...... سمجھی؟''

''کاش میں تمہاری طرح سوچ سکتی۔''

''کوشش کر دیکھو۔''

ہم دونوں نے کھانا ساتھ کھایا۔ میں نے گھر فون کر دیا۔ بے بی سسٹر بچوں کے پاس تھی۔ ہم دونوں ایئر پورٹ گئیں اور آخری لمحے تک باتیں کرتی رہیں۔ پرانی باتیں خوبصورت یادیں، ہم دونوں کالج کے خوش فکر طالب علموں کی طرح قہقہے لگا رہی تھیں۔

میں خوش تھی کہ اس سے دوبارہ رابطہ ہو گیا تھا۔ لیکن مجھے پورے آٹھ مہینے انتظار کرنا پڑا

اور آج ویلن ٹائن ڈے پر پہلی بار میں نے پھولوں کے ساتھ محبت نامہ بھی بھیجا ہے۔

میں نے لکھا ہے:

''تم میری زندگی کی پہلی اور آخری محبت ہو اس کے باوجود میں نے تمہیں پانے کی کوشش نہیں کی۔ میں نہیں جانتا میری گمنام محبت تمہارے دل میں میرے لیے کوئی گوشہ بنا سکی ہے یا نہیں، اصل میں میری پوری زندگی، میرے حسین تصورات بھیانک حقیقتوں سے ٹکرا ٹکرا کر پاش پاش ہوتے رہتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم ویسی ہی ہو جیسی کہ دکھائی دیتی ہو۔ لیکن اگر تم نے میری محبت کو ٹھکرا دیا یا اور کوئی ایسی بات ہو گئی جس سے میرے تصورات ٹوٹ گئے تو میں برداشت نہیں کر پاؤں گا اور میں نہیں جانتا کہ پھر میں جی بھی سکوں گا یا نہیں۔ تم میری زندگی کے صحرا کا واحد نخلستان ہو، تم میری روح ہو، تم میرے اندر سانس لیتی ہو اور میں زندگی کی آخری سانس تک تمہیں چاہتا رہوں گا۔ میں نے آج تک تمہیں ہزار ہا خط لکھے لیکن بھیجنے کی ہمت نہیں ہوئی لیکن اب شاید میرے اعصاب کمزور ہوتے جا رہے ہیں کہ پیمانہ صبر لبریز ہو گیا اور میں نے اپنی گونگی محبت کو زبان دے دی۔ تم کائنات کے کسی بھی حصے میں جا چھپو میں تمہیں ڈھونڈ نکالوں گا............ ہمیشہ سے تمہارا پجاری!''

یہ خط اور پھول سپیشل ڈلیوری سے آج ہی سیلی کو پہنچ جائیں گے۔ میں سیلی کے مرجھائے ہوئے چہرے پر گلاب کھلتے دیکھ رہی ہوں اور مسکراتے ہوئے اس کی آنکھیں بالکل غائب ہو گئی ہیں۔

پجاری

مجھے اس سے بالکل ویسی عقیدت ہے جیسی ایک پجاری کو دیوی سے ہوتی ہے۔ میں اسے دیکھتا ہوں تو میری روح سرشار ہو جاتی ہے اور جب میں سوچتا ہوں تو مجھے لگتا ہے میں مالا مال ہو گیا ہوں۔ میری روح کا ایک ایک گوشہ سیراب ہو گیا ہے۔ میں احساس تشکر اور مسرت سے بھیگ جاتا ہوں۔ ایک طمانیت میری روح میں اتر جاتی ہے۔

میں زیریں متوسط طبقے کا ایک فرد ہوں۔ جسم و جاں کے رشتے کو برقرار رکھنے کے لیے محنت، مشقت، بھاگ دوڑ اور اپنے معیار زندگی کو بہتر بنانے کے لیے وسائل و ذرائع کی تلاش اور اس کے لیے دوڑ دھوپ، میرے نزدیک تو یہی زندگی تھی اور یہی زندگی کا مقصد۔

بی بی جان کو ملنے سے پہلے مجھے کب معلوم تھا کہ جسم کے علاوہ روح اور ذہن کے بھی کچھ تقاضے ہوتے ہیں جو اگر پورے نہ ہو سکیں تو ایک کمی، ایک خلا سا رہ جاتا ہے۔ عدم تکمیل کا احساس بے چین و مضطرب رکھتا ہے۔

اور وہ ملی بھی تو کسی معجزے کی طرح ہیں۔ بالکل ویسے ہی جیسے آگ لینے جاؤ اور پیغمبری مل جائے۔

میرا دوست کمال اخبار کے دفتر میں کام کرتا ہے۔ اسے مختلف تقریبات اور ڈراموں وغیرہ کے پاس ملتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھار میں بھی اس کے ساتھ چلا جاتا ہوں۔

اس شام اس نے مجھے مشاعرے میں چلنے کی دعوت دی۔

''مشاعرہ؟'' میں نے اس کی پُر اشتیاق دعوت کے جواب میں کاہلی سے سوچتے ہوئے کہا۔

''ہاں خواتین کا عالمی مشاعرہ...... دور دور سے شاعرات آئی ہوئی ہیں بلکہ جاپان سے آئی ہوئی ایک شاعرہ سے انٹرویو کے لیے بھی وقت لینا ہے۔ کئی بار ارادہ کیا مگر کم بخت کے نہ آنے کا پتہ چلتا ہے نہ جانے کا۔ اس بار تو آج ہی ٹائم لے لوں گا۔''

خواتین کے مشاعرے کا سن کر میری آنکھیں چمک اٹھیں۔

''کیوں نہیں، کیوں نہیں...... ضرور چلوں گا یار...... اور وہ کم بخت جس کے نہ آنے کا پتہ چلتا ہے نہ جانے کا...... اس کے سامنے اسے جناب، محترمہ کہتے تمہاری زبان نہیں تھکے گی۔''

اور ہم دونوں ہنس دیے۔

ہم دونوں ایک ساتھ الحمرا پہنچے۔ پہلی دو قطاریں مقامی شاعرات کے لیے مخصوص تھیں اور تیسری پریس کے لیے۔ ہم عین درمیان میں براجمان ہو گئے۔

پروگرام کا آغاز ہوا۔ ناظم مہمان شاعرات کو باری باری ان کے مختصر تعارف کے ساتھ سٹیج پر آنے کی دعوت دے رہا تھا۔ میں ہر شاعرہ کی چال ڈھال، قد و قامت اور جسامت کو نظروں میں تولنے کے بعد اس کے لیے چپکے سے دل میں کوئی ریمارک پاس کر کے خود ہی لطف اندوز ہوتا رہا۔

سٹیج سج گیا تھا۔ ناظم نے استقبالیہ تقریر کا آغاز کیا اور میں نے پورے انہماک سے سٹیج پر بیٹھی شاعرات کا جائزہ لینا شروع کیا۔ پہلی، دوسری اور تیسری نشست سے ہوتی ہوئی میری نگاہ چوتھی نشست پر پڑی اور پھر کافی دیر وہیں الجھی رہی۔ میں نے بقیہ شاعرات کا جائزہ لیا مگر نظریں لوٹ کر پھر وہیں آ ٹکیں۔ معلوم نہیں کیوں وہ ان سب سے بہت مختلف، بالکل الگ لگ رہی تھی۔

میں تو وہاں صرف آنکھیں سینکنے آیا تھا۔ سوچا تھا تھوڑی دیر رک کر چلا جاؤں گا مگر اب میں نے پروگرام کے اختتام تک رکنے کا فیصلہ کر لیا۔

پروگرام ختم ہوتے ہی مداحین اور شائقین نے شاعرات کو گھیر لیا۔ کمال نے میرا جاپان سے آئی ہوئی شاعرہ سے تعارف کرایا تو مجھے معلوم ہوا کہ یہ تو وہی ہے جو نظروں کو باندھ لینے کا

جادو جانتی ہے۔" یاسمین...... چنبے دی بوٹی" میں نے دل میں سوچا۔

کمال نے اس سے انٹرویو کے لیے درخواست کی۔ تھوڑی سی ردوکد کے بعد وہ مان گئی۔ اس کی قیام گاہ پر اگلے روز گیارہ بجے قبل دوپہر کا وقت طے پایا۔

مقررہ وقت پر جب ہم وہاں پہنچے تو ہم سے پہلے ایک، خوش پوش اور خوش رو نوجوان بھی ان کا انتظار کر رہا تھا۔ سلام کرنے کے بعد کمال تو انٹرویو کے لیے تیار کردہ اپنے سوالنامے کی اصلاح و ترمیم میں لگ گیا اور میں نے وقت گزاری کے لیے اس نوجوان سے بات چیت شروع کر دی۔

تھوڑی سی دیر میں وہ آ گئی۔ اس نے معذرت کرتے ہوئے بتایا کہ اسے کچھ مہمانوں کو رخصت کرنا تھا۔

کمال اسے انٹرویو کرتا رہا اور میں اسے دیکھتا رہا۔ اس کھوج میں کہ اس میں کیا بات ہے، وہ اتنی مختلف کیوں دکھائی دیتی ہے...... میں فوری طور پر تو یہ بھید نہ پا سکا۔ مگر اس کی مختلف تصویریں ذہن میں لیے میں وہاں سے نکلا۔

"یار کمال کی عورت ہے یہ۔" میں نے اپنی حیرت کا اظہار کیا۔

"ہاں، بہت اچھی شاعرہ ہے۔" کمال نے جواب دیا۔

"میں اس کی شاعری کی بات نہیں کر رہا، وہ بہت اچھی انسان بھی ہے۔"

"یہ تم نے کیسے جانا؟"

"معلوم ہے وہ جو نوجوان تھا اس کا سابقہ ڈرائیور تھا۔ وہ اس کی اتنی تعریف کر رہا تھا کہ کیا بتاؤں۔ اس نے بتایا کہ ایک بار کسی غلط فہمی کی بنا پر اس نے اسے ڈانٹ دیا تو بعد میں غلط فہمی دور ہونے پر رو رو کر اس سے معافی مانگی۔ ایک اور موقعے پر بوجوہ اپنے بھانجے کی شادی میں شرکت نہ کر سکنے کی معذرت کرنے کے لیے آنے جانے کا ملا کر سولہ گھنٹے کا بس کا سفر کر کے گئیں اور صرف چار گھنٹے وہاں ٹھہر کر آ گئیں۔ وہ کہہ رہا تھا، میں نے کہا...... "باجی! یہ بات تو آپ فون پر بھی کر سکتی تھیں۔"

تو وہ بولیں۔ "نہیں حامد! اس طرح وہ بہتر طور پر سمجھ پائیں گی کہ اگر واپس جانا میری مجبوری نہ ہوتی تو میں ان کی خوشی میں شریک ہونے کی کتنی شدت سے خواہش مند تھی۔"

اس نے اسے پہننا، اوڑھنا، بولنا چالنا، بلکہ پڑھنا لکھنا تک سکھایا۔

"بس یا کچھ اور......؟" کمال نے ایک کمینی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔
"کیا مطلب؟"
"او میرے بھولے پنچھی!

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا

یہ سب مشہور لوگوں کے خود کو مقبول بنانے کے حربے ہوتے ہیں۔ ابھی تم کچھ دیر اور بیٹھتے تو دو ایک ملاقاتی اور بھی آ جاتے جو اس نوجوان کی طرح یاسمین صاحبہ کی عظمت کے گن گاتے اور ان کی اعلیٰ ظرفی کی داستانیں سناتے۔ یہ سب یا تو ان کے دوست احباب ہوتے ہیں یا خریدے ہوئے لوگ۔"
"تم اخبار والے پولیس والوں کی طرح اتنے شکی مزاج کیوں ہوتے ہو؟" میں نے چڑ کر کہا۔
"کیونکہ ہمارا آئے دن ان نام نہاد بڑے لوگوں سے واسطہ رہتا ہے۔ مگر میں ان کی چالوں میں نہیں آتا۔ سو میں یاسمین کی اس داستان عظمت کو نظر انداز کر دوں گا۔ پیسے ضائع بیچاری کے۔" کمال ہنسا۔
"کمینے ہو تم...... دنیا کا دستور ہی یہی ہے کہ برائی کو تو فوراً بغیر کسی تحقیق کے مان لیتی ہے اور اچھائی پر شک کرتی ہے۔"
"سیدھا سیدھا کیوں نہیں کہتے کہ یاسمین کے حسن کا جادو چل گیا ہے تم پر...... اب تم ہی بتاؤ وہ نوجوان کہیں سے ڈرائیور لگتا تھا۔"
شک کا بیج ایسا ہے کہ خشک، شور، بنجر کیسی بھی زمین میں ڈالو، خوب پھلتا پھولتا ہے اور اپنی جڑیں بہت گہری اور دور تک گاڑ لیتا ہے۔ اور میں جو سر تا پا اس کی عقیدت میں بھیگ کر نکلا تھا، سوچ میں پڑ گیا۔
"ویسے صورت سے بہت معصوم لگتی ہے...... ہے نا؟" کمال نے مجھے چھیڑا۔
مگر میں خاموش رہا۔
دوسرے روز کمال کا فون آیا۔ "یار، ایک کام ہے تم سے...... آج اخبار میں یاسمین کا انٹرویو چھپا ہے۔ میں خود جا کر اخبار دینا چاہتا تھا کہ یہ ایک روایتی اور اخلاقی رسم ہے مگر مجھے

ایک بہت اہم پریس کانفرنس میں جانا ہے، تم نے اس کا گھر تو دیکھ رکھا ہے، ذرا جا کر اسے اخبار تو دے آؤ۔ وہاں جانے سے پہلے فون کر لینا، کارڈ لیا تھا نا تم نے اس سے۔"

خوش نصیبی یوں خود آ کر میرے در پر دستک دے گی، مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں اشتیاق کے پر لگا کر اڑتا ہوا کمال کے دفتر پہنچا۔ اخبار لیا اور یاسمین صاحبہ کی جائے قیام کا رخ کیا۔ مجھے فون کرنے کا خیال آیا۔ مگر پھر کمال کی کل کی باتیں یاد کر کے ارادہ ترک کر دیا تا کہ اصل صورت حال کا کچھ سراغ ملے۔

میں اندر داخل ہوا تو وہ پہلے سے وہاں موجود تھیں۔ عجیب ہی منظر تھا۔ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھری ہوئی تھیں اور ان کے مقابل ایک صورت سے بیمار اور نادار خاتون بیٹھی رو رہی تھی۔

وہ کچھ شرمندہ سی ہو کر آنکھیں پونچھتے ہوئے بولیں۔ "تشریف رکھیے۔"

"نہیں، میں چلتا ہوں...... مجھے کہیں اور جانا ہے۔ میں معافی چاہتا ہوں کہ فون کیے بغیر آ گیا اور مخل ہوا۔" میں سچ مچ شرمندہ تھا۔

"کوئی بات نہیں۔" وہ بھیگی بھیگی آنکھوں کے ساتھ مسکرا دی۔ "کمال صاحب کو میرا شکریہ کہہ دیجئے گا۔"

جب میں باہر نکل رہا تھا تو مجھے باجی یاسمین کے اس خاتون جیسے کچھ اور ملاقاتی بھی اندر جاتے ہوئے دکھائی دیے اور میرے دل میں پڑے شک کے بیج کو عقیدت و احترام کی تیز رو ندی بہا کر لے گئی۔ میں مسحور سا وہاں سے نکلا۔

اس کی بھیگی آنکھوں میں لو دیتی وہ دردمندی، اس کے چہرے کی ملائمت میں گھلتا ہوا وہ دکھ اور اس کے لبوں پر دمکتی وہ مسکراہٹ......

عجیب ناقابلِ تشریح بھید بھری مسکراہٹ تھی وہ، کیا تھا اس مسکراہٹ میں...... میں سوچتا رہا۔ اس میں روشنی تھی، رنگ تھا اور معصومیت تھی...... اور ...... اور مٹھاس تھی...... اور...... اور...... غالباً تھوڑی سی تلخی بھی تھی...... اور...... اور ہاں، شاید خلوص بھی تھا...... لیکن اس کے علاوہ بھی اس میں کچھ تھا۔ اور آخر مجھ پر کھلا کہ اس کی مسکراہٹ میں وہ ماورائے بیان مگر احساس میں گہری سے گہری اترتی چیز کچھ ویسی ہے جیسی دیویوں کے چہرے پر ہوتی ہے۔ خلوص، محبت، دردمندی مگر ایک فاصلے سے، ایک بلندی سے اور میں نے اسے بلا تاخیر دیوی

مان لیا۔ اس ادراک کے بعد مجھے اپنا منصب پہچاننے میں دیر نہ لگی۔ میں اس کا پجاری بن گیا۔ یہ سب سمجھنے اور جاننے کے بعد ایک گہرا سکون میرے اندر اتر گیا۔

پھر سنا کہ چند روز بعد بی بی جان واپس چلی گئیں۔ ان کی غلامی کا اعزاز حاصل کرنے کے بعد میں یاسمین صاحبہ کو احتراماً بی بی جان کہنے لگا تھا۔ ایک رشتہ ایک تعلق جواز خود بن گیا تھا وہ مجھ پر میرے اندر کی دنیا کے راز کھولتا گیا۔ میری ذات مجھ پر منکشف ہوتی گئی اور میں حیران رہ گیا کہ اب تک میں کتنی نامکمل اور ادھوری زندگی گزار رہا تھا......صرف حیوانی سطح پر......اگر وہ نہ ملتیں تو شاید میں اس روحانی تجربے سے محروم رہتا۔

میں نے کمال کو کچھ نہیں بتایا۔ اپنے پوشیدہ خزانے کا پتہ کوئی کسی کو دیتا ہے بھلا......

یہ بھی کیسی انوکھی بات ہے کہ جب کوئی مثبت جذبہ، جیسے انسانیت، محبت، عقیدت، احترام دل میں گھر کر لیتا ہے تو دل کیسا گداز ہو جاتا ہے، بالکل موم کی طرح دھیمی سی آنچ بھی اسے پگھلا دیتی ہے، درد چاہے اپنا ہو یا پرایا، ایک سی تڑپ اور اضطراب ہوتا ہے۔ شاید دل دل کہلانے کا حق دار ہی تب بنتا ہے۔ بی بی جان کی تصویر میرے ذہن میں ابھرتی۔ وہ ملائم چہرہ، وہ بھید بھری مسکراہٹ، وہ بھیگی پلکوں والی زمردیں آنکھیں اور میرا دل بھر آتا۔

جب یہ کیفیت دن بدن شدت اختیار کرتی گئی تو آخر مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے کارڈ نکالا اور ای میل میں انہیں صاف لکھ دیا کہ میں ان کے فن کی گہرائی اور ادبی مقام سے تو صحیح طور پر آگاہ نہیں ہوں مگر ان کی پاکیزہ اور بلند روح کی چند جھلکیاں دیکھنے کے بعد ان سے عقیدت کا جو رشتہ جوڑ بیٹھا ہوں، وہ ان کی روح کی طرح معصوم اور سچا ہے اور اتنا ہی حقیقی ہے جیسے اُن کا وجود، خود میرا اپنا وجود......اگر میرے لائق کوئی بھی خدمت ہو تو حکم کریں میں اسے بجا لانا اپنا اعزاز سمجھوں گا۔

کچھ روز تک جواب نہ آیا تو میں پریشان ہو گیا کہ میری جرات بے جا پر بی بی جان برا نہ مان گئی ہوں۔ ویسے کیا بی بی جان کو یہ معلوم نہیں کہ پجاری کو اظہار عقیدت کے لیے دیوی سے اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی اور میں اس حقیقت سے بھی بخوبی آگاہ ہوں کہ دیوی کی مورتی کے سامنے جو ایک نازک سی طلائی یا نقرئی زنجیر ہوتی ہے۔ وہ اگرچہ اتنی چھوٹی اور نیچی ہوتی ہے کہ اس پر سے ہاتھ بڑھا کر مورتی کو چھوا جا سکتا ہے مگر دراصل یہ زنجیر پجاری اور دیوی کے درمیان حد فاصل ہوتی ہے جسے عبور کرنے کا وہ تصور بھی نہیں کرتا۔

اور پھر ان کا جواب آ گیا۔ انہوں نے بڑی شفقت سے لکھا تھا کہ اگرچہ ان میں ایسی کوئی خوبی نہیں جس کا اس نے ذکر کیا ہے مگر وہ اس کے جذبات کی قدر کرتی ہیں کہ دنیا میں بے لوث و بے غرض تعلق اور رشتے اب ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کے لفظوں میں سچائی کی خوشبو اپنا ثبوت آپ تھی۔

جواب پا کر میں سرشار ہو گیا۔

پھر وقتاً فوقتاً میں اپنے مسائل وغیرہ میں ان سے مشورہ مانگ لیتا۔ وہ ہمیشہ ایسا اچھا مشورہ دیتیں جو کوئی بھی عام دنیا دار انسان نہ دے سکتا تھا۔ میں آنکھیں بند کر کے ان کے مشورے پر عمل کرتا۔ جس کا نتیجہ اگرچہ تاخیر سے، مگر ہمیشہ اچھا نکلتا۔

میرے اصرار پر اب بی بی جان مجھے چھوٹے موٹے کام بتانے لگیں۔ میں بہت خوش تھا کہ بی بی جان نے مجھے اس قابل سمجھا۔

چند ماہ بعد وہ پھر آئیں۔ وہ اپنی ادبی برادری میں سے کسی سے نہ ملیں اور نہ کوئی ان سے ملنے آیا۔ غالباً انہیں اطلاع نہیں تھی۔

بی بی جان کی شخصیت کے بھی کتنے پہلو تھے جو انہوں نے پوشیدہ رکھے ہوئے تھے۔ خوش قسمتی سے اتفاقاً ان کے ڈرائیور کے سبب ان کی شخصیت کے بند دروازے کے پیچھے کی ایک جھلک دیکھنے کو مل گئی تھی۔ اس مختصر دورے میں انہوں نے مجھے اپنے فلاحی کاموں میں معاونت کی عزت بخشی۔

اس کے چھ ماہ بعد وہ اپنی کتاب کے اجراء کے سلسلے میں آئیں۔ میں ملنے گیا۔ وہاں اور لوگ بھی موجود تھے۔ کتاب کی تقریب رونمائی پر بات ہو رہی تھی۔ بی بی جان نے کئی کام میرے ذمے بھی لگائے یہ کہتے ہوئے کہ یہ ذمے دار شخص ہے۔ مجھے اس پر پورا بھروسہ ہے۔

میری پوجا مکمل ہو گئی تھی ورنہ دیوی کے تو بے شمار پجاری ہوتے ہیں۔

میں دیکھ رہا تھا کہ ان کے معزز دانشور ملاقاتی بی بی جان کے نفیس سیاہ لباس میں سے فانوس میں جلتی شمعوں کی طرح جھلکتی بازوؤں کی چاندی کو اپنی میلی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے اس سے پہلے بھی اس بات کو محسوس کیا تھا۔ وہ جب بھی ملنے آتے یوں گفتگو تو شعر و ادب، قدیم و جدید رجحانات اور ایسے ہی دقیق مسائل پر کرتے لیکن دراصل یہ سب ان کے حسن سے آنکھیں سینکنے، ان کی آواز کی شیرینی اور بے ساختہ اداؤں سے لطف لینے کا بہانہ

ہوتا مگر بے نیاز اور بھولی بی بی جان کا ادھر دھیان ہی نہیں جاتا اور پھر ان میں مروت بھی تو بہت ہے۔ اخلاقاً ہر ایک سے خوش خلقی اور ملائمت سے بات کر لیتی ہیں۔ اب میں انہیں یہ سب کیسے بتاؤں کہ یہ میرا منصب نہیں اور پھر حفظ مراتب کا لحاظ بھی تو ہے۔ میں عمر میں ان سے بارہ تیرہ برس چھوٹا ہوں۔

پھر تقریب کا دن آ گیا۔ تقریب بہت شاندار تھی۔ وہ دھوپ رنگ ساڑھی پہنے ہوئے تھیں بلکہ یوں لگ رہا تھا کہ ان کے بدن کے سورج کی روشنی ہی ان کا لباس بن گئی ہے۔ اشتیاق، اضطراب اور خوشی کے ملے جلے جذبات سے تمتمایا ہوا ان کا چہرہ بہت معصوم اور دلنواز لگ رہا تھا۔ وہ سینکڑوں نگاہوں کی مرکز تھیں اور میرا دل فخر و غرور سے بھر گیا کہ میری دیوی کا استھان کتنا اونچا ہے۔

تقریب کے اختتام پر جب میں سٹیج پر سے وہ آرائشی اشیاء سمیٹ رہا تھا جو ہم بی بی کے گھر سے لائے تھے تو وہ ان صاحب سے جنہوں نے تقریب کی نظامت کی تھی اور جو غالباً کوئی ممتاز ادبی شخصیت تھے کچھ پریشان سی ہو کر کہہ رہی تھیں کہ انہوں نے نوٹس تو بنا لیے تھے تا کہ بولتے ہوئے کچھ بھول نہ جائیں۔ لیکن وہ پوائنٹس کارڈز گھر پر ہی رہ گئے اور انہیں لگتا ہے ان کی تقریر کچھ بے ربط سی ہو گئی تھی۔

''آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہیں، آپ نے کیا کہا اس طرف کس کا دھیان تھا۔ وہ لوگ تو آپ کی گوری کمر کو دیکھ رہے ہوں گے۔'' اور وہ گھٹیا پن سے ہنسنے لگا۔

بی بی جان کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ یہ دیکھ کر وہ شخص عجلت میں الوداعی کلمات تک کہے بغیر رخصت ہو گیا۔

بی بی جان کو پہلے غصے میں اور پھر مایوس و مغموم دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہوا۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں تخلیق کی صلاحیت بخشی ہے، خوبصورت سوچ دی ہے۔ وہ اتنی محنت کرتی ہیں، اظہار و بیان کے کیسے کیسے خوبصورت پیرائے اختیار کرتی ہیں اور یہ ہوس کار ان کے فن کے حسن کو سراہنے کے بجائے انہیں صرف ایک عام عورت سمجھ کر تاڑتے ہیں۔ ان حیوانوں کو عورت میں جسم کے علاوہ کچھ دکھائی نہیں دیتا؟

''نہیں بی بی جان! اس کی بکواس پر نہ جائیں۔ اس نے صرف اپنے ذہن کی گندگی اگلی ہے، سب لوگ پوری توجہ سے سن رہے تھے۔ کوئی بے ربطی نہیں تھی آپ کی تقریر میں، ہاں کچھ

پوائنٹس رہ گئے ہوں تو یہ اور بات ہے۔"

بی بی جان کے چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا۔

اور میں سوچ رہا تھا...... شکر ہے اس کمینے نے تھوڑا سا کھل جانے والا بی بی جان کا پیٹ نہیں دیکھا جس پر ایک موٹا سا کالا تل یوں لگ رہا تھا جیسے برف میں کھلا سیاہ گلاب۔

میں دیکھتا تھا اور حیران ہوتا تھا کہ یہ دیویوں کی مورتیں ایسی کیوں ہوتی ہیں۔ اتنے بھرے بھرپور بدن پر برائے نام لباس...... اور اب میں جان گیا ہوں کہ پجاری کی عقیدت دیوی کا لباس ہوتی ہے۔ وہ اس کے خدوخال اور سراپے سے پرے اس کی شوکت وعظمت کے حضور خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔ اپنی دعاؤں کی مستجابی، اس کی نظر کرم اور اپنے سکون دل کے لیے عرض گزار ہوتا ہے۔ یہ سب باتیں میں نے بی بی جان کے حوالے سے جانی اور سمجھی ہیں۔

ان کی صحبت میں ان کی زندہ مثال سے میں نے دردمندی و دل سوزی، بے لوث و بے غرض خدمت اور انسانیت کے ایسے ایسے سبق سیکھے ہیں، جس نے مجھ جیسے کندۂ ناتراش کو اپنی تخلیق کے مقصد سے آشنا کیا اور میں محض حیوان ناطق سے انسان بننے کی کوشش کرنے لگا۔

تقریب سے اگلے روز علی الصبح ان کی فلائٹ تھی۔

ویسے بی بی جان بھی کچھ عجیب ہیں۔ اتنی جلدی جانے کی کیا تک تھی۔ کم از کم ایک آدھ دن تو تقریب کی باتیں کرتے، کامیابی کی خوشی مناتے۔ میں اُداس ہو گیا۔

ٹھیک ہے وہ ہر گھڑی، ہر لمحہ میرے ساتھ ہیں۔ مگر ان کی صحبت کے جو مثبت اثرات ہوتے ہیں، یہ دوری اس سے تو محروم کر دیتی ہے۔ میرا دل بھر آیا۔

میں دن بھر کی بھاگ دوڑ سے تھکا ہوا تو تھا ہی، تکیے پر سر رکھتے ہی نیند نے آ لیا۔ مگر تھوڑی ہی دیر بعد ایک عجیب خواب سے ڈر کر جاگ گیا ہوں۔ میرا پورا بدن پسینے میں بھیگا ہوا ہے اور میں کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہا ہوں۔ کیا دیکھتا ہوں کہ دور تک پھیلا ہوا ایک جنگل ہے، جس میں چلتا چلا جا رہا ہوں لیکن جنگل میں نہ پرندوں کے بولنے کی آوازیں ہیں نہ جانوروں کی۔ عجیب وحشت زا سناٹا ہے۔ میں کچھ خوفزدہ سا ہو جاتا ہوں۔ اچانک دور جھاڑیوں میں مجھے بی بی جان کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ میں حیران ہوتا ہوں کہ بی بی جان یہاں کہاں!...... اور میں اس سمت چل دیتا ہوں۔ قریب پہنچ کر کیا دیکھتا ہوں کہ وہ خود بی بی

جان نہیں ان کا مجسمہ ہے، بالکل دیویوں والی آن بان ہے۔ نقرئی کام والا سفید جالی کا لباس زیب تن ہے جس سے ان کے بدن کا حسن دوبالا ہو رہا ہے، آنکھیں بند ہیں اور لبوں پر وہی بھید بھری مسکراہٹ ہے۔

میں سر جھکا کر ان کے قدموں میں بیٹھ جاتا ہوں اور پھر بے اختیار ان کے دودھیا پیروں کو چھو لیتا ہوں۔ پیروں کو چھونے پر مجھے احساس ہوتا ہے کہ وہ مرمر کے نہیں موم کے بنے ہوئے ہیں۔ مجھے حیرت آن لیتی ہے۔ میں اپنے شبے کی تصدیق کے لیے مجسمے کو اٹھا کر دیکھتا ہوں تو وہ کسی پھول کی طرح سبک محسوس ہوتا ہے۔

میں فانوس میں جلتی موم شمعوں کو چھو کر دیکھتا ہوں، پھر سیاہ گلاب کو...... پھر کھلتی کلیوں کو...... پھر...... پھر...... اور پھر وہ مجسمہ یعنی بی بی جان اپنی بند آنکھیں کھول دیتی ہیں۔

دراز گھنی پلکوں والی زمردیں آنکھیں، قہر و جلال سے بھری انگاروں کی طرح جل رہی ہوتی ہیں۔ میں لرز اٹھتا ہوں اور میری آنکھ کھل جاتی ہے۔

میں حیران ہوں مجھے ایسا خواب کیوں دکھائی دیا۔ بجا کہ وہاں ان کی مورت کے سامنے طلائی زنجیر نہیں تھی۔ مگر وہ حد فاصل تو ہمہ وقت میرے ذہن میں ہے اور میں نے کبھی ایسا تصور بھی نہیں کیا۔ کبھی ان کو میلی آنکھ سے نہیں دیکھا۔ ان کی برتری اور عظمت میرے دل پر نقش ہے۔ مجھے اپنا مقام اپنا منصب معلوم ہے۔

میں جانتا ہوں یہ سب شیطان لعین کی کارستانی ہے۔ یہ راکھشس رشیوں منیوں اور اوتاروں کی تپسیا بھنگ کرنے کے لیے ایسے ہی حربے استعمال کرتا ہے، اولیاؤں کو بھٹکانے کی کوشش کرتا ہے۔

میں نہ اوتار نہ ولی، مجھ سے کیا لینا ہے شیطان کو...... مگر کہتے ہیں جہاں مال ہو وہیں چور آتا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ اللہ کے فضل و کرم اور بی بی جان کے توسط سے میرے اندر سچائی کا کچھ نور موجود ہو۔

''یا اللہ! میں تیری پناہ چاہتا ہوں...... میں سراپا التجا ہوں۔''

مگر اس خواب کی تصویریں بار بار میرے ذہن کے پردے پر ابھرتی ہیں اور میں گھبرا کر ''لاحول......'' کا ورد کرنے لگتا ہوں۔

من کے نین ہزار

میں نے دیکھا تو اسے کئی بار تھا۔ ملے جلے گہرے رنگوں کی سنہرے کنارے والی ساڑھی پہنے، ایک ہاتھ میں سونے کے دو کڑے اور دوسرے میں ساڑھی کی ہم رنگ کانچ کی چوڑیاں، دونوں ہاتھوں میں ایک ایک انگوٹھی، درمیان کی مانگ، مانگ کے دونوں طرف پیشانی سے ہوتی ہوئی رخساروں کو چھوتی دو گھنگھریالی لٹیں، بالوں کی ڈھیلی ڈھالی لمبی چوٹی پشت پر پڑی ہوتی، جس میں موتیے اور گلاب کے مصنوعی پھولوں کے گجرے ٹکے ہوتے۔ جن کی کچھ لڑیاں تو اس کی چوٹی سی لپٹی رہتیں اور کچھ چہرے کے پاس سے ہوتی ہوئی آگے کندھے پر پڑی رہتیں۔ کانوں میں چھوٹے چھوٹے جھمکے ہلکورے لے رہے ہوتے اور گلے میں منگل سوتر۔ آنکھوں میں کاجل کی ہلکی سی تحریر، ہونٹوں پر ہلکے رنگ کی لپ اسٹک اور اگر چہرے پر کوئی میک اپ ہوتا بھی تھا تو اس کی گندمی مائل سانولی رنگت پر بالکل دکھائی نہ دیتا اور اس سارے اہتمام کے باوجود وہ بے حد سادہ دکھائی دیتی اور اس کی وجہ اس کے چہرے کا سادہ اور منکسر تاثر تھا۔

وہ گرد و پیش سے بے نیاز ہو کر بڑے انہماک سے گاتی اور اس کی انگلیاں خودکار انداز میں ہارمونیم سروں پردوں پر رقص کرتی رہتیں۔

وہ ساؤتھ انڈین تھی۔ اس کا عام بول چال اور اردو کا تلفظ عام ساؤتھ انڈینز جیسا ہی تھا

مگر غزلوں کی گائیکی کے لیے اس نے اتنی مشق بہم پہنچائی تھی کہ ان میں اس کا تلفظ بالکل صحیح اور ادائیگی بالکل صاف تھی۔

اور اگر اسے جاننا کہہ سکتے ہیں تو میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ وہ ڈاکٹر آرتی چاولہ ہے۔ پروگرام کے اختتام پر اگر آمنا سامنا ہوتا تو وہ نمستے کے انداز میں ہاتھ جوڑ کر سلام علیکم کہتی اور میری مزاج پرسی پر اپنی اسی سادہ اور منکسر مسکراہٹ کے ساتھ دائیں بائیں سر ہلا دیتی۔ عموماً یہی ہوتا ہے کہ ہم حالات کا تجزیہ کئے بغیر سہولت سے ایک بنی بنائی فضا کا حصہ بن جاتے ہیں۔ حالات کا تجزیہ کئے بغیر بڑی سہولت سے ایک بنی بنائی فضا کا حصہ بن جاتے ہیں مگر اس ماحول سے دور ہوتے ہی اس کے اثرات زائل ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور ہم اپنے دماغ سے کام لینا شروع کر دیتے ہیں۔ اب بھی وہ واقعہ یاد آنے پر میرے ہونٹوں پر خود بخود مسکراہٹ بکھر جاتی ہے۔

ایک بار میرا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ مجھے چوٹیں تو خیر بہت آئیں مگر خطرناک نہیں تھیں اور کوئی ہڈی وغیرہ بھی نہیں ٹوٹی تھی۔ کار البتہ بالکل تباہ ہوگئی تھی اور قصور چونکہ میرا تھا اس لیے دوسری پارٹی کا نقصان بھی مجھے ہی بھرنا تھا کیونکہ میری کمپری ہینسو (Comperhensive) انشورنس نہیں تھی۔

میری پڑوسن پوجا نے سنا تو سوپ بنا کر ساتھ لیے بھاگی بھاگی آئی۔ میری چوٹوں پر دوائی لگائی، سینکائی کی اور پھر سوپ پینے پر اصرار کرنے لگی۔ میں بہت چڑچڑی ہو رہی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ بری طرح جھٹک دیا تو وہ جھلملاتی آنکھوں سے بڑے دکھ سے بولی۔ ''میں تیرے لیے کتنا پریشان ہوں، تجھے کیا پرواہ۔ سالی ادھر تیری فوجیں مارتی ہیں، ادھر تو مارتی ہے۔'' (ان دنوں سرحد پر کشیدگی تھی) مجھے ہنسی آگئی۔ ہم دونوں دیر تک ہنستے رہے اور وہ سوپ پلا کر ہی ٹلی۔

ڈاکٹر آرتی چاولہ بھی پاکستانی کمیونٹی کے ہر کلچرل پروگرام میں آتی تھی یہاں تک کہ یوم پاکستان کے پروگرام میں بھی اس نے بچوں کے ترانے کے ساتھ ہارمونیم پر سنگت کی۔

قصہ کچھ یوں ہے کہ ہم اختیاری ہجرت کرنے والوں کو وطن کی یاد بہت ستاتی ہے اور ہمیں بڑی شدت سے اپنی جڑوں، اپنی مٹی سے جڑے رہنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس

لیے اپنے ہم وطنوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے اور ان کے ساتھ مل بیٹھنے اور اپنی شناخت برقرار رکھنے کے لیے ہم نے ایک ایسوسی ایشن بنا رکھی ہے۔ جو سال بھر میں دو چار ایسے پروگرام کر لیتی ہے جس میں سب اکٹھے ہو سکیں۔ وطن سے اپنا رابطہ بحال رکھنے کے لیے کسی نہ کسی فنکار کو بھی بلا لیا جاتا ہے میں چونکہ ادب کی پرستار ہوں تو میں نے ایسوسی ایشن میں ڈائریکٹر ہونے کی حیثیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کسی ادبی شخصیت کو مدعو کرنے کا اضافہ کر لیا۔ اسی سلسلے میں ایک بڑے شاعر پاکستان سے تشریف لانے والے تھے۔ پروگرام کو دلچسپ بنانے کے لیے ان کی غزلیں بھی گائی جانے والی تھیں جس کے لیے میں نے کلچرل کمیٹی کا در کھٹکھٹایا اور اسی سلسلے میں میرا ڈاکٹر آرتی چاولہ سے براہ راست رابطہ ہوا۔

میری مصروفیت کے پیش نظر غزلیں لینے کے لیے وہ خود میرے پاس چلی آئی۔ وہ دیکھنے میں جیسی سادہ لگتی تھی۔ بات چیت میں بھی بالکل ویسی لگی۔ تبھی مجھے پتہ چلا کہ وہ فزیشن نہیں، پی ایچ ڈی ڈاکٹر ہے اور وہ بھی فزکس میں، آرٹ اور سائنس کا دلچسپ امتزاج۔ میں غزلیں پڑھتی گئی اور وہ ہندی رسم الخط میں لکھتی گئی۔ صحیح تلفظ کی ادائیگی کے لیے اسے بہت محنت کرنی پڑی مگر ماتا ل کار وہ سیکھ گئی۔ اب اسے خود ہی ان غزلوں کی دھنیں بنانی اور گانی تھیں۔

وہ جیسے ہی کوئی دھن بناتی فوری طور پر مجھے فون پر سناتی۔ اکثر اوقات ہارمونیم لیے خود چلی آتی۔ ان ملاقاتوں کی وجہ سے میری اس سے بے تکلفی ہو گئی تھی اور ایک ذہنی رابطہ سا بن گیا تھا۔ کئی دھنیں بنانے کے بعد آخر کار دھنیں طے پا گئیں۔

میں نے ڈاکٹر آرتی سے کہا۔ ''میرے پاس تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں آرتی! تم نے اتنا وقت دیا ہے، مجھے وقت کی قیمت کا بخوبی اندازہ ہے خصوصاً تمہارے وقت کا۔''

''شکریہ کس بات کا، میں نے آپ کو وقت نہیں دیا۔ یہ تو سرسوتی دیوی کی بھینٹ ہے جس نے مجھے گلا دیا، کلا دی، مجھے بہت شانتی ملتی ہے گانے میں۔''

''تو پھر مجھے بھی گانا سکھا دو آرتی، میرا من بہت اشانت ہے۔''

خلاف توقع اس نے کوئی سوال نہیں کیا کہ دنیا کی ہر نعمت ہوتے ہوئے میرا من اشانت کیوں ہے؟ اس نے صرف نظر بھر کر مجھے دیکھا اور لمحہ بھر کو تو میں لرز گئی۔ آرتی کی آنکھوں کا وہ

سادہ سا تاثر جو اکثر خالی خالی سا لگتا اور بعض اوقات تو اس کی آنکھیں گائے کی آنکھوں کی طرح فہم وفراست سے خالی لگتی تھیں۔ مگر اس لمحے وہ شفاف آنکھیں کچھ ایسی لگیں کہ مجھے گہرے پانیوں میں ڈوبنے جیسی کیفیت کا احساس ہوا اور میں نے گھبرا کر نظریں جھکا لیں۔

''میں کہاں اتنا گانا جانتی ہوں کہ آپ کو سکھاؤں۔ آپ میڈی ٹیشن (Meditation) کیا کریں۔ اس سے بھی من کو شانتی ملتی ہے۔''

''تم کرتی ہو؟''

''ہاں، کوشش کرتی ہوں، ابھی چھ مہینے ہوئے ہیں شروع کیے۔''

اس نے مجھے میڈی ٹیشن کے لیے انداز نشست بتانے کے بعد مزید ہدایات دیں کہ ''اپنے ذہن کو ہر خیال سے خالی کر لیں مگر خیال تو آئیں گے، تو آپ صرف ان خیالوں کو دیکھتی رہیں۔''

''کیا؟'' میں سمجھ نہ پائی۔

''Watch your thoughts'' اس نے وضاحت کی۔

''دھیرے دھیرے خیال آنے کم ہو جائیں گے اور پھر جب خیال آنا بند ہو جائیں تو اپنا دھیان تیسری آنکھ پر لگا کر اس خیال یا مقصد پر دھیان لگا دیں جس کو آپ پانا چاہتی ہیں۔''

''تیسری آنکھ؟''

''ہاں آپ کی دونوں بھنوؤں کے بیچ ماتھے پر تیسری آنکھ، من کی آنکھ۔''

بولی۔ ''کل سے شروع کر دیں، میں فون کر کے معلوم کرتی رہوں گی۔'' اور وہ چلی گئی۔

دوسرے دن اس نے فون کیا اور میڈی ٹیشن کا حال پوچھا۔

بولی۔ ''خیالوں نے تو بہت تنگ کیا ہوگا آپ کو؟''

''نہیں، میرے ذہن میں تو کوئی خیال نہیں آیا۔''

''کیا؟'' وہ چونکی۔

اور دس منٹ بعد وہ میرے سامنے تھی۔

''آپ تو پہلے دن ہی وہاں پہنچ گئیں۔ جہاں میں چھ مہینے میں بھی پوری طرح نہیں پہنچ

پائی۔'' اس کی نظروں میں عجیب دکھ اور حسرت تھی۔

''آپ کی آتما بہت پوتر ہے۔'' اس نے جیسے سرگوشی کی۔

''ارے نہیں آرتی، آتما تو تمہاری پوتر ہے، میں تو بہت دنیادار ہوں۔''

وہ کچھ دیر بے چین سی بیٹھی رہی اور چائے کی پیالی ختم ہوتے ہی اٹھ گئی۔

پروگرام سے ایک دن پہلے وہ میرے پاس آئی۔

''سب ٹھیک ہے نا، جی کوئی کام ہو، کوئی ہیلپ کی جرورت ہو تو بتائیں۔''

''ہاں، سب ٹھیک ہے۔ بس کل تم ٹائم سے آ جانا۔''

''جرور سے جرور۔'' اس نے دائیں بائیں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''میڈی ٹیشن کیسی چل رہی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''میں اس پروگرام کی تیاری میں ذہنی طور پر اتنی الجھی ہوئی تھی کہ میڈی ٹیشن کی ہی نہیں اس پروگرام کے بعد باقاعدگی سے شروع کروں گی۔ تم سناؤ تم کہاں تک پہنچیں؟'' میں نے یونہی جواباً پوچھ لیا۔ تب مجھے بالکل معلوم نہیں تھا کہ یہ الفاظ اس کی شخصیت کے بند کواڑوں کو کھولنے والا اسم اعظم ہیں اور مجھے اس کی آتما میں جھانکنے کا موقع ملے گا۔

''میں کہاں تک پہنچی ہوں؟'' اس نے میرا سوال خود کلامی کے انداز میں دہرایا۔

''میں جہاں پہنچنے کی سرتوڑ کوشش کر رہی ہوں۔ پتہ نہیں وہاں پہنچنا میرے نصیب میں ہے کہ نہیں...... یہ سب میرے کرموں کا پھل ہے۔'' وہ اداس ہو گئی۔

''پچھلے جنم کے؟''

''ہاں، معلوم نہیں یہ میرا کون سا جنم ہے۔'' وہ سوچ میں ڈوب گئی۔

''ہمارے ہاں تو دوسرا جنم ہوتا ہی نہیں، اگر ہوتا تو معلوم ہے میں کیا کرتی؟''

''کیا کرتیں؟'' وہ اپنی کیفیت میں سے ذرا سا باہر نکلی۔

''یہ جو میرا میاں ہے نا، اس سے عشق کر کے ساری عمر اس کو اپنے پیچھے بھگاتی۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟''

''اس لیے کہ شادی کے بعد گھر کی مرغی دال برابر ہو جاتی ہے۔'' میں نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ میں نے اسے پہلی بار ہنستے دیکھا تھا ورنہ تو وہ صرف مسکراتی تھی۔

''آپ لوگوں کے مزے ہیں، اتنے جنم ہیں، ہم تو......''

اور اس نے خلاف عادت میری بات کاٹ دی۔ ''نہیں، ایسا نہیں ہے۔''

اور پھر وہ مجھے سمجھانے لگی۔

''دیکھو وہ سنسار پرلوک ساگر ہے اور ہم ایک بوند...... بوند کا انت کیا ہے؟ ساگر میں مل جانا، مگر بوند پہلے کسی ندی میں جائے گی، پھر دریا میں اور پھر پتہ نہیں کن کن راستوں سے ہو کر ساگر میں جا ملے گی۔ ہمارا ہر نیا جنم پچھلے جنم کے کرموں کا پھل ہوتا ہے اور آتما پوتر ہوتے ہوتے آخری جنم تک بالکل پوتر ہو کر Ultimate Truth سے جا ملتی ہے، اپنی منزل سے۔''

''اور جو کوئی سات جنموں میں بھی پوتر نہ ہو تو۔''

وہ کپکپا سی گئی۔ ''تب وہ............'' اور اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

مگر بھگوان تو بار بار موقع دیتا ہے، کیونکہ جس پورے سچ، پوری پوترتا کا ہم حصہ ہیں، جس ساگر کی ہم بوند ہیں، ہماری منزل تو اسی میں جا کر شامل ہوتا ہے اور یہ سات جنم کا چکر تو اسی سفر کو طے کرنے کے لیے ہے نا۔''

میں چپکی بیٹھی سنتی رہی۔

''ایسا بہت کم ہوتا ہے، مگر رشی منی، سادھو، سنت جو سنسار تیاگ کر اسی دھیان میں لگ جاتے ہیں وہ پہلے جنم میں ہی نروان پا جاتے ہیں جنم چکر سے چھوٹ جاتے ہیں، کوئی دوسرے میں کوئی تیسرے میں اپنے اپنے درجے ہیں۔''

''پچھلے جنم میں تو تمہارے کرم بہت اچھے ہوں گے جو ایسا اچھا جنم ملا، اب اگلا جنم......''

اور اس نے تڑپ کر یوں میری بات کاٹی جیسے میں نے اسے کوئی بددعا دے دی ہو۔

''نہیں، مجھے کوئی اور جنم نہیں چاہیے، مجھے نروان چاہیے، مجھے مکتی چاہیے۔ اسی کے لیے تو جتن کرتی پھر رہی ہوں۔'' اس کی آواز میں ایک درد، ایک فریاد تھی، میں حیران رہ گئی۔

''تمہیں یہ سفر ختم کرنے کی اتنی جلدی کیوں ہے آرتی؟ یہ دنیا تو بڑی پیاری جگہ ہے۔ اسے کوئی بھی خوشی سے نہیں چھوڑنا چاہتا۔ چاہے وہ دکھ تکلیف میں بھی ہو اور تمہیں تو ماشاءاللہ

کوئی کمی نہیں، گھر ہے، پتی ہے، بچے ہیں۔ تمہارے اپنے پاس تعلیم ہے، جاب ہے اور سب سے بڑھ کر فن ہے۔''

وہ تھوڑی دیر تو چپ رہی اور پھر اپنے مخصوص انداز میں سر ہلا کر بولی۔ ''سو تو ہے۔''

''تو پھر یہ ناشکرا پن نہیں ہے؟''

''کیا بولے جی!'' وہ زیادہ ٹھیٹ اردو سمجھ نہیں پاتی تھی۔

''Ungratefulness'' میں نے وضاحت کی۔

''نہیں جی، ایسی کوئی بات نہیں، بھگوان کی بڑی کرپا ہے، مگر......''

''مگر کیا؟''

''مگر جینا کوئی آسان کام تھوڑی ہے۔''

میرے ذہن میں ایک سوال کلبلایا اور تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے آداب کو بھی بالائے طاق رکھ دیا۔

''آرتی! تمہارے پتی تم سے پریم کرتے ہیں؟''

''ہاں، ہم ایک دوسرے کا بہت کھیال رکھتے ہیں۔''

''تو یہ کہنے میں کیا ڈر ہے کہ تم ایک دوسرے سے پریم کرتے ہو، اب بھی شرماتی ہو۔''

''نہیں جی، یہ بات نہیں۔ وہ دراصل پریم میں Beleive نہیں کرتے۔''

''کیا مطلب؟'' میں حیران رہ گئی۔

''وہ کہتے ہیں کہ پریم، کوی اور لکھاری لوگوں کی Imagination ہے، Obsession ہے، ابنارملٹی ہے، ورنہ ہر کوئی اپنی ضرورتوں کو اچھے سے پوری کرنا چاہتا ہے اور بس۔''

''نہیں آرتی، دنیا میں پیار کے علاوہ رکھا ہی کیا ہے، اس کو نکال دو تو انسان اور جانور میں فرق ہی کیا رہ جاتا ہے۔ ایک دوسرے کے دکھ درد کو سمجھنا، ان کے دکھ سکھ میں کام آنا، یہ سب پیار ہی تو سکھاتا ہے۔''

''سو تو ہے، مگر وہ کہتے ہیں کہ یہ سب Social Obligation سمجھ کر بھی کیا جا سکتا ہے۔''

''اوہ!'' میں نے بڑے دکھ سے آرتی کو دیکھا۔

''نہیں جی، یہ بات نہیں۔ مجھے کوئی اچھا نہیں پریم وغیرہ کی، کوئی دکھ نہیں اس بات کا۔''

''تمہارے بچے تو تم سے پیار کرتے ہیں؟''

''ویسے ہم ایک دوسرے کا بہت کھیال رکھتے ہیں۔ مگر وہ بھی باپ کی طرح سوچتے ہیں۔''

''آرتی، خود سے جھوٹ نہ بولو۔ اگر تمہیں اس بات کا کوئی دکھ نہیں تو تمہیں جینا مشکل کیوں لگتا ہے۔ زندگی سے یہ گریز کیوں؟''

''کیا بولے جی؟''

''کچھ نہیں۔''

''اصل میں مجھے زندگی بتانی نہیں آتی۔''

''کیا مطلب؟''

''دماگ کام نہیں کرتا۔''

''تم نے پی ایچ ڈی کر رکھی ہے اتنی قابل پروفیسر ہو اور دماغ کام نہیں کرتا، یہ اچھا مذاق ہے۔'' میں ہنسی۔

''نہیں جی، میں صحیح کہہ رہی ہوں، بکس میں تو جو لکھا ہوتا ہے، سیدھا سیدھا پڑھ لیا، سمجھ لیا۔ مگر یہ ایوری ڈے لائف میری سمجھ میں نہیں آتی۔ اصل بات تو ایوری ڈے لائف کے ساتھ ڈیل کرنا ہے۔''

''آرتی، ایسی کیا بات ہے۔ چھوٹی چھوٹی غلطیاں اور اونچ نیچ تو سب سے ہی ہو جاتی ہے۔''

''نہیں میں ہوں ہی بیوقوف، غلط نہیں کہتے وہ۔ مجھے سچ مچ ہی بہت سی باتوں کا کھیال نہیں آتا۔ اس روز میں نے نیا Egg Beater جلا دیا...... 110 کا تھا، 220 پر لگا دیا۔ مجھے خیال ہی نہیں آیا کہ میں چیک کر لیتی۔ وہ اسی بات پر تو ڈانٹ رہے تھے کہ پڑھی لکھی ہو کر ایسا کیوں کرتی ہوں۔ جان بوجھ کر دھیان نہیں دیتی۔''

''اتنی سی بات پر ڈانٹ دیا؟''

''وہ تو خیر کوئی بات نہیں، نقصان ہوتا ہے تو غصہ تو آ ہی جاتا ہے۔'' اس نے بڑے سکون سے کہا۔

''پھر؟''

''پھر کچھ نہیں۔''

''ہر بات پر آمنا و صدقنا کہنے والی، ان کی انا کو تسکین پہنچانے والی اور ایسی کہاں ملے گی انہیں۔'' میں نے اپنی روانی سے کہا۔

''کیا بولے جی؟''

''اگر تم بھی ویسی ہی Strong Headed ہوتیں تو تمہارے پتی کو سمجھ آتی۔''

''معلوم نہیں۔'' وہ کھوئی کھوئی سی بولی۔

''اسے تو تمہاری قدر کرنی چاہیے۔ آج کل کے زمانے میں یہ صفتیں نایاب ہیں، اتنی سادگی، اس قدر معصومیت۔''

''میری دادی اور ماں بھی یہی کہتی تھیں، مگر بھگوان غلط ہے، مجھے یہ کوالٹیز (Qualities) دینے کے لیے۔'' وہ تلخی سے مسکرائی۔

''وہ سمجھتے ہیں میں Pretend کرتی ہوں، Innocent ہونے کا ناٹک کرتی ہوں۔''

اس کی آواز بھیگ گئی اور اس کی آنکھوں کے پیالے لبالب بھر گئے۔ اسے دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے درد و غم کی انسانی شکل میں تجسیم کر دی گئی ہو۔''

''اس روز میرے بیٹوں کے دوست آئے ہوئے تھے۔ میں نے خوب کھانے دانے کا بندوبست کیا۔ آخر میں چائے بنانے لگی تو چولہا دوسرا جلایا اور دیگچی دوسرے پر رکھ دی۔''

''الیکٹرک کوکنگ رینج ہے تمہارے پاس۔''

''جی!''

''تو یہ کون سی بڑی بات ہے۔ میرے ساتھ بارہا ایسا ہوا ہے۔ اس میں فوراً اندازہ نہیں ہو پاتا جلنے کا۔''

لیکن میرا بیٹا بولا۔

''Mom! Stop trying to be cute''

اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ میرا دل چاہا، اسے گلے لگاؤں لیکن وہ تو بالکل پگھلی ہوئی موم لگ رہی تھی۔ مجھے لگا کہ وہ ڈھے کر ڈھیر ہو جائے گی، ہیئت بگڑ جائے گی اس کی، اس کا جسم ہولے ہولے یوں لرز رہا تھا جیسے سسکیاں روک رکھی ہوں۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ اسے کیسے دلاسا دوں۔ اس لیے میں اس کے لیے پانی یا جوس لینے چلی گئی۔

واپس آئی تو وہ پھر سے اپنے اندر اتر کر کواڑ بند کیے بیٹھی تھی۔ اس کی سمندروں جیسی گہری اور جذبوں سے لبریز آنکھیں پھر فہم و فراست سے عاری گائے کی آنکھوں جیسی لگ رہی تھیں۔

''تم انہیں بتاتی کیوں نہیں کہ تم کلاکار ہو اور کلاکار کا دماغ عام آدمی سے مختلف ہوتا ہے، ان کا چھوٹی چھوٹی باتوں میں زیادہ دھیان نہیں ہوتا۔ وہ جان بوجھ کر ایسا نہیں کرتے۔ This is how they are''

''میں انہیں کیوں بتاؤں، پوری عمر بتائی ہے میں نے ان کے ساتھ، انہیں خود کیوں نہیں معلوم۔''

''تمہاری بیٹی ہوتی تو وہ تمہاری ہمدم و ہمراز ہوتی، بہت سکون رہتا تمہیں۔''

''نہیں جی، مجھے اس کی کوئی اچھا نہیں۔''

''کیوں؟'' میں حیران رہ گئی۔

''اگر وہ بھی میرے جیسی ہوتی تو؟''

''تو تمہارا دکھ سمجھتی۔''

''نہیں جی، میں اتنی کٹھور نہیں۔''

''میں سمجھی نہیں۔''

''میں اسے بھی اپنی طرح جیون نرگ میں جلتے دیکھ کر سہن نہ کر پاتی۔''

میں چپ ہو گئی تو وہ بولی۔

''آپ مجھے Self Centered نہ سمجھیں۔''

''ایسی تو نہیں لگتیں تم۔''

''ہوں بھی نہیں، میں جانتی ہوں سنسار میں کتنا دکھ ہے۔ بہت سے لوگوں کے پاس

روٹی نہیں اور میرا پیٹ بھرا ہوا ہے۔ بہت سے لوگ بے گھر ہیں اور میرے سر پر چھت ہے، بہت سے لوگ اکیلے ہیں، کوئی اپنا نہیں اور میرے پاس پورا پریوار ہے۔ میرے پاس ایجوکیشن ہے، جاب ہے۔ میں یہ ساری Blessings Count کر کے بھگوان کا شکر کرتی ہوں۔ جتنا میرے سے ہو سکتا ہے۔ دوسروں کے دکھوں میں حصہ بانٹتی رہتی ہوں۔ پھر بھی یہ چھوٹے چھوٹے دکھ بہت دکھی کرتے ہیں۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی نیا کانٹا میرے دل میں چبھتا رہتا ہے کوئی نہ کوئی نئی چوٹ مجھے زخمی کرتی رہتی ہے اور میں اپنے اندر لہولہان ہوتی رہتی ہوں میرا من بہت اشانت رہتا ہے۔''

اس زخمی فاختہ کے دکھ پر میرا بھی دل بھر آیا۔ کچھ بول نہ پائی۔ صرف سر ہلا کر رہ گئی۔

''مجھے کسی سے کوئی گلہ نہیں، کوئی اچھا نہیں، کوئی دکھ نہیں، میں پہلے ہی مر چکی ہوں، میرا یقین کرو۔'' وہ مسکرائی۔

اور مجھے اس کی مسکراہٹ سے اتنا ڈر لگا جیسے سچ مچ کوئی لاش مسکرا دی ہو۔ میں کیا کہتی، میرے پاس کہنے کو تھا ہی کیا، بس اس کا کپکپاتا ہوا برف ہاتھ تھام لیا۔

''چلتی ہوں۔'' اور وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

اور دوسرے دن وہ شوخ رنگوں کی سنہرے بارڈر والی ساڑھی پہنے، بالوں میں موتیے گلاب کا گجرا ٹانکے، کجیاری آنکھیں جھکائے مگن ہو کر گا رہی تھی اس کی انگلیاں پھرتی سے ہارمونیم پر رقص کر رہی تھیں اور دو گھنگھریالی لٹیں پیشانی سے اتر کر رخساروں کو چھو رہی تھیں۔

پھر بعض وجوہات کی بنا پر میں واپس اپنے وطن منتقل ہو گئی۔ سال میں ایک بار گرمیوں کی چھٹیوں میں چکر لگتا۔ پچھلی بار میں گئی تو وہ انڈیا گئی ہوئی تھی۔

ایک سال اور گزر گیا۔

اور پھر مجھے پتہ چلا کہ آرتی کو بریسٹ کینسر ہو گیا ہے۔ مگر اتنی دیر سے پتہ چلا کہ اگر سرجری نہ کرنے میں خطرہ ہے تو کرنے میں اس سے بھی زیادہ ہے۔ کافی صلاح مشورے کے بعد آخر کار سرجری طے پا گئی۔

اور مجھے یہ سب جس روز پتہ چلا اس سے اگلے روز اس کا آپریشن تھا۔ میں نے سوچا، اس وقت ڈسٹرب بھی ہو گی اور فیملی کے لوگ بھی اکٹھے ہوں گے، میں سرجری کے بعد اسے

دیکھنے چلی جاؤں گی۔

اور آج ڈاکٹر جسیم کا فون آیا ہے کہ آرتی آپریشن کے بعد کوما میں چلی گئی اور یہ اس کی تحریری ہدایت تھی کہ اسے مصنوعی لائف سپورٹ پر نہ رکھا جائے۔ اور آج شام آرتی نے پران تیاگ دیے۔ اس کی معصوم دکھی آتما موہ مایا کے جال سے آزاد ہو گئی۔ بوند ساگر میں جا ملی۔ اپنی منزل سے Ultimate Truth سے۔

آئینہ آئینہ

وہ دیکھتے ہی اسے بھا گئی تھی۔ جانے کیا تھا اس میں کہ وہ دوسروں سے بالکل الگ لگ رہی تھی، من موہنی سی!

ایک سے ایک حسین و طرحدار لڑکی تھی پارٹی میں اور نینا بینا تو سب کی نگاہوں کا مرکز تھی۔ دونوں بہنیں رنگ روپ میں یکتا، شوخ و حسین، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور سوسائٹی کے ادب و آداب سے واقف...... اماں اور بہن کا خیال تھا کہ اس کا فیصلہ ان دونوں میں سے کسی ایک کے حق میں ہوگا۔

مگر گندمی رنگت اور صاف ستھرے نقوش والی مریم، بادامی رنگ کے لیس کے سوٹ میں ملبوس، جیسے خود میں چھپی ہوئی بہت باوقار لگ رہی تھی۔ فاختہ سی اس معصوم لڑکی نے اتفاقاً ہی اس کی طرف دیکھا۔ نظریں ملیں اور دوسرے ہی لمحے سیاہ پلکوں کی جھالر نے مدھ کے پیالوں کو ڈھانپ لیا۔ وہ مسکرا دیا لیکن وہ اب بھی دوسری طرف دیکھ رہی تھی۔ یہ واحد لڑکی تھی جس نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ اس کے متوجہ ہونے پر بھی کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔

اس کے فیصلے سے اماں بہت خوش ہوئیں۔ انہیں بھی سیدھی سادی خاموش طبع مریم بہو کے طور پر زیادہ پسند تھی۔ بہن کو البتہ ملال تھا کہ اب بھتیجے بھتیجیاں اتنے خوبصورت نہیں ہوں

گے جتنے نینا یا بینا کے ساتھ شادی کرنے سے ہوتے، لیکن اس سے بھی انکار نہیں تھا کہ مریم میں ایک عجیب کشش ہے، ایک وقار ہے۔

مگر اس بظاہر سیدھی سادی مریم نے رشتے کے لیے ناک رگڑوا ڈالی۔ ماں باپ تو راضی تھے مریم ہی مان کے نہیں دیتی تھی۔

بہن نے بتایا۔ ''وہ کہتی ہے ابھی اسے پڑھنا ہے، پڑھائی مکمل کرنے کے بعد شادی کرے گی۔''

''اچھا!'' وہ سوچ میں پڑ گیا۔

''پڑھائی انکار کے لیے بہانہ بھی ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے وہ تم سے شادی نہ کرنا چاہتی ہو۔ ہو سکتا ہے اسے کوئی اور پسند ہو، جس کے لیے اسے انتظار کرنا پڑ رہا ہو۔'' بہن نے سمجھایا۔

مگر وہ بھی کوئی جادو ہے جو سر چڑھ کر نہ بولے۔

''تمہارے ہاتھ تو بات آنی چاہیے، کسی نہ کسی طرح میری تحقیر کرنے کی...... وہ سچ مچ پڑھنا چاہتی ہو گی، اس میں کون سی برائی ہے۔'' وہ چڑ کر بولا۔

''تو اگر آپ کو اس سے محبت ہے تو اس کی خواہش کا احترام کریں، اسے پڑھنے دیں، کہیں اور شادی کر لیں۔'' بہن بھی کیوں وار خالی جانے دیتی۔

''ٹھیک ہے پڑھ لے، میں انتظار کر لوں گا۔''

اس وقت تو اس نے محض بہن کو نیچا دکھانے کے لیے کہہ دیا تھا لیکن جب اماں نے اسے دو ایک اور لڑکیاں دکھائیں تو اسے لگا کہ وہ من موہنی صورت نظروں میں بسنے کے بعد اور کوئی اس کی نگاہوں میں جچ ہی نہیں رہی۔ اور وہ سچ مچ اس کی پڑھائی ختم ہونے کا انتظار کر سکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کے گھر والے بھی ایک اچھے، خوشحال گھرانے کے اعلیٰ تعلیم یافتہ، خوبرو اور مہذب جوان کا رشتہ ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتے تھے۔ جب اماں ہمت ہار کر بیٹھ رہیں تو خود انہی کی طرف سے پیش رفت ہوئی اور بات شروع ہونے کے چھ ماہ بعد شادی بخیر و خوبی انجام پا گئی۔

''مریم! اگر تم پڑھنا چاہتی ہو تو اپنی پڑھائی جاری رکھ سکتی ہو، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' اس نے کہا۔

مریم نے ایک لمحے کو نظریں اٹھائیں اور دوسرے ہی لمحے سیاہ پلکوں کی جھالر نے مدھ کے پیالوں کو ڈھانپ لیا، وہ سرشار ہو گیا۔

''کوئی بات نہیں۔'' وہ میٹھی سی مدھم لے میں جیسے گنگنائی۔

گھر گرہستی میں وہ خوب رچ بس گئی۔ اماں بھی خوش تھیں اور بہن بھی۔ اس نے اس کا بھی ہر طرح خیال رکھا۔ دوستوں وغیرہ کے ساتھ ملنا ملانا بھی ٹھیک چل رہا تھا۔ پہننے اوڑھنے کا بھی خوب سلیقہ تھا اور صورت تو اس کی پیاری تھی ہی۔

اسے اس کی شرم و حیا بہت بھائی تھی۔ مگر کافی عرصہ گزر جانے کے بعد بھی وہ اس پر کھلی نہ تھی۔ تنہائی کے لمحوں میں اسے ہر بار یہی محسوس ہوتا جیسے وہ آج پہلی بار مل رہے ہیں بلکہ بعض اوقات تو زبردستی محسوس ہوتی۔ گریز بلکہ کسی حد تک دفاع۔ وہ یہ سوچ کر مسکرا دیتا کہ اپنی شادی کبھی پرانی نہیں ہونے والی۔

لیکن اس کا یہ احتراز اس کی آتش شوق کو اور بھڑکاتا۔ وہ کبھی روشنی بجھائے بغیر چھونے بھی نہیں دیتی تھی اور اس کے دل میں چاندنی کے اس شہر کے نظارے کا اشتیاق بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اس نے دو ایک بار مریم سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تو وہ برا مان گئی۔ اور وہی ادا جس پر وہ نثار ہوا تھا اب اسے کھلنے لگی تھی۔ اب ایسی بھی کیا شرم و حیا...... کمال ہے آدمی اپنی ہی بیوی کے لیے اتنا ترسے۔

اور آخر اس نے بہت سوچ بچار کے بعد ایک ترکیب ڈھونڈ نکالی۔ وہ ایک قد آدم آئینہ لے کر آیا اور اسے بیڈ کے ساتھ والی دیوار سے لگا دیا۔ اس کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ اس وقت گھڑی سائیڈ ٹیبل پر رکھنے کے بہانے لیمپ جلا دے گا، یوں جیسے غلطی سے ہاتھ پڑ گیا ہو اور فوراً بجھا بھی دے گا اور اس دوران وہ اسے براہ راست دیکھنے کے بجائے آئینے میں دیکھ لے گا تاکہ مریم کو اس کی نیت پر شک نہ ہو۔ کیونکہ وہ صاف لفظوں میں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر چکی تھی۔ اب اتنی اچھی بیوی سے اتنی سی بات پر جھگڑا بڑھایا تو نہیں جا سکتا تھا۔

''ارے یہ آئینہ کہاں سے آیا؟'' مریم نے پوچھا۔

''آج ہی لایا ہوں، سیڑھیوں کے سامنے دیوار پر لگانے کے لیے۔ تیار ہو کر باہر جاتے ہوئے پورا سراپا نظر آ جایا کرے گا اس میں۔'' اس نے جواب دیا۔

مریم ہنس دی۔ ''ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں دیکھنے سے اطمینان نہیں ہوتا۔''

''اس کے سامنے سے تو تم ہٹتی ہی نہیں آخر وقت تک...... میں تو باتھ روم کے آئینے سے گزارہ کرتا ہوں۔''

''ہاں، سیڑھیوں میں آئینہ لگانا برا خیال نہیں۔'' وہ سوچتے ہوئے بولی تھی۔

اور پھر اس رات اس نے منصوبے کے مطابق گھڑی رکھنے کے بہانے کروٹ لے کر لیمپ جلا دیا اور پھر فوراً ہی بجھا بھی دیا مگر اس کے ساتھ ہی خود بھی یوں بجھ گیا جیسے اس کے اندر جلتی ہوئی زندگی کی روشنی بجھ گئی ہو۔ اس کا سارا اشتیاق اور جوش و خروش صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ مریم کے چہرے پر شرم و حیا کے دلکش رنگ نہ تھے۔ اس کے چہرے پر شدید بیزاری اور نفرت تھی، سلگتی ہوئی نفرت، اس کے گریز، احتراز بلکہ کسی حد تک دفاع کے معنی اس کی سمجھ میں آنے لگے...... تو وہ اسے برداشت کرتی ہے مگر اس نے اپنا آپ اس کے حوالے نہیں کیا۔

اس کے منتشر ہوتے ذہن میں بہن کا جملہ گونجا...... ''ممکن ہے وہ تم سے شادی ہی نہ کرنا چاہتی ہو اور پڑھائی کا صرف بہانہ بنا رہی ہو۔''

وہ ایک لمحہ

رونقیں، ہنگامے اور ''ہویدا جی'' لازم و ملزوم تھے بلکہ ہنگاموں کا دوسرا نام ہویدا جی تھا۔ معلوم نہیں وہ اب تک اس ہلا گلا میں اپنی دلچسپی کیسے قائم رکھے ہوئے تھیں حالانکہ وہ عمر کے اس دور میں داخل ہو چکی تھیں جہاں گزرے ہوئے ماہ و سال اپنے نقوش ثبت کرتے اور سنجیدگی کی چھاپ لگا دیتے ہیں۔ پتہ نہیں وہ اپنے پرانے امیج کو نبھا رہی تھیں یا سچ مچ ہی انہوں نے عمر اور وقت کو شکست دے دی تھی۔ انہیں دیکھ کر سبھی کھل اٹھتے۔ ''شکر ہے ہویدا جی آ گئیں، کچھ تو یہ بور یکسانیت ٹوٹے گی۔''

اپنی دوستوں اور خاندان بھر میں وہ بے حد مقبول تھیں۔ خصوصاً نوجوان لڑکیوں میں کیونکہ وہ اپنی ذمہ داری پر سب کے والدین سے اجازت لے کر بچوں کو ان کی من مانی کرنے کے مواقع فراہم کرتیں۔ سب کو ہویدا جی پر بھروسہ تھا۔ اکثر پروگراموں کا خرچ بھی وہ خود اٹھاتیں۔ چھوٹے، بڑے ہر عمر ہر رشتے کے لوگ انہیں ''ہویدا جی'' ہی کہتے۔ وہ سب کی دل جان تھیں وہ اپنے سارے راز انہیں بتاتے، صلاح مشورے لیتے۔ اور کیا مجال کہ کبھی ایک کی بات دوسرے تک پہنچ جائے۔ ہاں مشترکہ گپ شپ، شرارت اور چھیڑ چھاڑ کی بات دوسری تھی۔

شہر میں قدم دھرتے ہی جیسے ان کی خوشبو چاروں طرف پھیل جاتی۔ آن کی آن میں سب کو ان کی آمد کی خبر ہو جاتی۔ شام پڑتے ہی سب اپنے ضروری، غیر ضروری سب کام چھوڑ

چھاڑ کر ہویدا کے گرد جمع ہو جاتے۔ فوراً ہی کوئی پروگرام بن جاتا جس میں رنجگا تو بہت ضروری تھا کیونکہ ہویدا جی بہت کم وقت کے لیے آتی اور ظاہر ہے اپنے کسی کام سے آتی۔ مگر بچوں کے لیے وہ کچھ وقت ضرور مخصوص رکھتی۔

اس بار ہویدا کا ڈیرہ اپنی ماموں زاد بہن جلیس کی طرف تھا۔ حسب معمول سب جمع تھے۔ پہلے سے کوئی پروگرام بنائے بغیر سب وین میں ٹھسا ٹھس بھر گئے۔ جلیس کے بیٹے رئیس نے ڈرائیو کرنے کے لیے اپنی رضا کارانہ خدمات پیش کیں۔ ان دنوں رئیس کے ٹیسٹ ہو رہے تھے اس لیے جلیس کو کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا کیونکہ اس کے بیٹے کا وقت ضائع ہوتا، مگر رئیس نے ماں کی خفگی کو نظر انداز کر دیا وہ اس سنہری موقع کو کیسے کھوتا۔

کم گو اور شرمیلے رئیس کا چہرہ خوشی سے گلنار ہو رہا تھا۔ خوب خوب گھومنا پھرنا تفریح ہوئی۔ رات کا کھانا بھی باہر کھایا گیا۔ فلم کا پروگرام بھی بنا مگر ایک ساتھ اتنے ٹکٹ نہ مل سکے اس لیے گھر لوٹنا پڑا۔

اب بجائے گھروں کو واپس جانے کے پھر سے محفل جم گئی۔ اچانک ہی کسی نے فرمائش کر دی۔ ''آئس کریم کھلائیں ہویدا جی۔'' ہویدا خاموش رہی تو اصرار اور بڑھ گیا پھر تو ''آئس کریم، آئس کریم'' کے نعرے لگنے لگے۔ ہویدا نے اشارے سے سب کو خاموش کرایا اور گویا ہوئیں۔

''دراصل مابدولت کے خزانہ عامرہ میں اس وقت صرف سو روپے موجود ہیں۔ رعایا چاہے تو بچشم خود اس کا معائنہ کر سکتی ہے۔''

اور ہویدا نے پرس الٹ دیا جس میں سے سو کا تنہا نوٹ پھڑ پھڑاتا ہوا باہر آ پڑا۔ سب کھلکھلا کر ہنس دیں۔ ہویدا نے اپنی بات جاری رکھی۔

''ہاں اگر رعایا نذرانہ پیش کرنے کا شرف حاصل کرنا چاہے تو اجازت ہے۔ ان کی خواہش پوری کی جائے گی۔''

تھوڑی ہی دیر میں پیسے جمع ہو گئے۔ اب رہا مسئلہ آئس کریم کا، تو طے یہ پایا کہ اتنی رات گئے پھر سے سب کے جانے کے بجائے گھر پر منگوالی جائے۔

''رئیس کو بھیج کر منگوا لیتے ہیں۔'' کسی نے مشورہ دیا۔

''نہیں بھئی، پہلے ہی اس کا بہت وقت ضائع ہوا ہے اور مجھے یقین ہے وہ جانے کو مانے گا بھی نہیں۔'' ہویدا بولیں۔

''انکار تو وہ نہیں کرے گا۔'' راج ہنسنی گردن موڑ کر مسکرائی۔

''اچھا یہ بات ہے۔'' ہویدا بولی۔

''میں کہہ دوں تو بھی منع نہیں کرے گا۔'' غلافی آنکھوں نے شراب لنڈھائی۔

''اچھا!'' ہویدا ادھر متوجہ ہوئی۔

''اور دونوں کے کہے سے نہ مانے تو میں جو موجود ہوں۔'' مونالیزا دھیرے سے مسکرائی۔

''بھئی چکر کیا ہے؟'' ہویدا واقعی چکرا گئی۔

''پچھلے سال وہ مجھ پر بہت مہربان تھے۔'' راج ہنسنی بولی۔

''حضرت کی چشم کرم مجھ پر بھی رہی ہے۔'' غلافی آنکھیں ایک ادا سے ہنسیں۔

''اور آج کل میرے شیدوں میں سے ہے۔'' مونالیزا مسکرائی۔

''ارے وہ ایسا تو نہیں لگتا، مبالغہ نہ کرو...... اصل قصہ بتاؤ۔'' ہویدا متجسس تھی۔

''اصل قصہ یہ ہے کہ حضرت ذرا اچھی صورتوں کے شیدائی ہیں۔ ہم لوگ بھی اس کی اس کمزوری کا خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔ تھوڑی سی لفٹ کرا کر خوب خوب بیوقوف بناتے ہیں اور وہ بیچارے خوشی سے بے حال ہو کر خادم حسین بنے اشاروں پر ناچ رہے ہوتے ہیں۔ بس ہم سب مل کر خوب لطف لیتے ہیں ان کی جانثاریوں کا۔'' مونالیزا نے احوال واقعی سنایا۔

''نہیں بچیو! بری بات ہے، وہ بہت بھلا لڑکا ہے۔ تم اس کی خوبیوں کو یوں ملیامیٹ نہ کرو۔ کام تو وہ ہر ایک کے اپنی طبعی شرافت کی وجہ سے آتا ہے۔ کام تو وہ میرے بھی بڑی خوشی سے کر دیتا ہے۔ ہاں، یہ عمر ہی ایسی ہے۔ یہ الگ بات ہے اور یہ تم جو اسے بیوقوف بنانے کے لیے فلرٹ کرتی تو اس کی آوارہ نگاہی کی کچھ ذمہ داری تم پر بھی آتی ہے۔'' ہویدا جی اپنے شہد گلاب لہجے میں بولتی چلی گئیں۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، آئندہ ایسا نہیں کریں گے...... پکا وعدہ۔ مگر آج تو آئس کریم منگوانے دیں۔

''جاؤ تم بلا لاؤ خادم حسین کو۔'' راج ہنسنی نے مونالیزا کو شرارت سے دھکا دیا۔

اور تبھی رئیس ٹی وی لاؤنج میں سے گزر کر اوپر جاتا دکھائی دیا۔

''ذرا بات سننا رئیس!'' نغافی آنکھوں نے ترچھی نظر کے بان چلائے۔

''جی فرمائیں۔'' رئیس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

وہ اپنی نگاہوں کے تیروں کے خطا جانے پر چونکی۔ مونا لیزا مدد کو آئی۔

''ذرا آئس کریم لا دو گے؟'' رس میں ڈوبی گلابی مسکراہٹ بھی بے اثر گئی۔

''میرا کل ٹیسٹ ہے، مجھے پڑھنا ہے۔'' جواب ملا۔

حیران حیران راج ہنسی کی کک بھی پہنچ گئی۔ مگر رئیس کا جواب نہ بدلا۔

''میرا آج پہلے ہی بہت وقت ضائع ہو گیا ہے، مزید کی گنجائش نہیں۔'' اور وہ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

''وقت ضائع ہوا ہے......؟'' تینوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ''یہ آج کیا ہو گیا ہے اسے۔'' وہ حیران تھیں۔

''امی سے مار پڑی ہو گی۔'' اور وہ تینوں ہنسنے لگیں۔

ہویدا جی کے ساتھ ان کی ساری گفتگو سننے کے بعد رئیس کو ان سے زیادہ خود پر غصہ آیا۔ وہ سب بہت چالاک سہی مگر وہ خود اتنا بیوقوف کیوں ہے۔ اسے خود پر اتنا قابو کیوں نہیں۔ وہ تو ہویدا جی کی باتوں سے اسے اتنا حوصلہ ملا کہ اس نے مزید بیوقوف بننے سے انکار کر دیا ورنہ وہ تو شاید یہ ذلت بھی سہہ جاتا اور کچھ کہنے کا حوصلہ نہ ہوتا۔

''ہویدا جی! آپ سے ایک بات کرنی ہے مگر آپ کے پاس تو وقت ہی نہیں۔'' رئیس بولا۔

''ارے تمہارے لیے وقت نہیں...... کیسی باتیں کرتے ہو؟ میں ثمینہ کی طرف جا رہی ہوں، تم ہی ڈراپ کر دو۔ اچھا خاصہ آدھے پون گھنٹے کا راستہ ہے، اطمینان سے بات بھی ہو جائے گی......ٹھیک ہے؟''

''ہویدا جی میرے ساتھ ایک پرابلم ہے۔''

''کیا بھئی؟''

''مجھے لڑکیاں بہت اچھی لگتی ہیں۔''

''تو اس میں پرابلم کی کون سی بات ہے؟''

"ہے نا، رات آپ نے سنا تھا وہ مجھے کتنا ذلیل کر رہی تھیں۔"

"ہاں، رات کی باتیں سننے کے بعد میں چاہ رہی تھی کہ تم سے اس موضوع پر بات کروں۔"

"اب اگر آپ نے خود سن لیا ہے تو میرا کام آسان ہو گیا ہے۔ بات آسانی سے آپ کی سمجھ میں آ جائے گی۔"

"سنو ریس! لڑکیاں تو سب لڑکوں کو اچھی لگتی ہیں۔ فطری بات ہے لیکن ایک جانور اور انسان میں یہ فرق ہے کہ انسان اپنے جذبات پر قابو پا سکتا ہے اور خود کو سوسائٹی کے پسندیدہ طریقوں کے مطابق ڈھال سکتا ہے۔ اب اگر تم ہر لڑکی کے پیچھے پھرو گے تو کوئی بھی تمہیں سنجیدگی سے نہیں لے گی اور تم مذاق کا نشانہ ہو گے جس سے تمہاری عزت نفس مجروح ہو گی۔"

"ہاں، مجھے رات بہت برا لگا تھا ان کی باتوں کا۔"

"تو بس سیدھی سی بات ہے، آرام سے پڑھو لکھو، اچھی صورتیں یقیناً اپنی طرف کھینچتی ہیں مگر انہیں دل میں ہی سراہ کر گزر جاؤ جیسے کسی خوبصورت پھول کو دیکھ کر۔ ہاں اگر تمہیں سچ مچ دل کی گہرائیوں سے کوئی اچھا لگے تو اور بات ہے۔"

"مگر مجھے کیسے پتہ چلے گا کہ کون مجھے دل کی گہرائیوں سے اچھی لگ رہی ہے اور کس میں مجھے وقتی کشش محسوس ہو رہی ہے۔"

ہویدا کھلکھلا کر ہنس دی۔ "پگلے! یہ کسی سے پوچھنے کی بات نہیں ہوتی، کوئی بتا تا نہیں ہے، یہ تو تم اپنے دل سے جھانکو گے تو تمہیں خود ہی پتہ چل جائے گا۔ یہ تو یوں واضح ہوتی ہے جیسے ستاروں کے بیچ میں چاند۔"

"اچھا تو آپ کو خوب تجربہ ہے۔"

"بس، بس...... حد ادب!" وہ مسکرائیں۔

"ویسے آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے میرے لیے اتنی اچھی رائے کا اظہار کیا۔"

"شکریے کی کوئی بات نہیں، تم ہو ہی ایسے۔"

اور دفعتاً ہویدا جی چلائیں۔ "روکنا، ذرا روکنا، میں ثمینہ کے لیے گجرے لیتی جاؤں، اسے اچھا لگے گا۔"

"آپ کو ہر وقت یہ کیوں دھیان رہتا ہے کہ دوسروں کو کیا اچھا لگے گا۔"

''اس لیے کہ ایسا کرتے ہوئے خود مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔''

اور پھر رئیس میں ایک حیران کن تبدیلی آئی۔ جب اسے قریبی رشتہ داروں کی ایک شادی میں شرکت کا اتفاق ہوا تو سب لڑکیوں کو بہت افسوس ہوا۔ ان کے ہاتھوں سے اچھی خاصی تفریح نکل گئی تھی۔ وہ ہنسی مذاق میں بھی شریک ہوا مگر اس کا انداز بالکل بدل چکا تھا۔ اس معجزے پر سب سے زیادہ خوشی رئیس کی والدہ کو ہوئی جو اس کی اس عادت سے بہت نالاں تھیں۔

رئیس کو ہر دم یہ فکر دامن گیر رہتی کہ ہویدا جی کی نظروں میں اپنا مقام برقرار رکھے۔ انہوں نے جو اس کے متعلق قیاس کیا تھا وہ اس پر پورا اترنا چاہتا تھا۔ ان کی غیر موجودگی میں بھی یہی خیال اس کا نگران رہتا کہ کوئی نامناسب بات نازیبا حرکت اس سے سرزد نہ ہو کہ جس کی خبر ان تک پہنچے۔ کیا سوچیں گی وہ، اور یہ خودنگہداری رفتہ رفتہ اس کے کردار کے حسن کو نکھارتی گئی۔ عادات واطوار میں معقولیت تو پہلے ہی تھی، ہوتے ہوتے وہ ایک باوقار نوجوان بن گیا۔

اب اسے ہر وقت ہویدا جی کا انتظار رہتا۔ کب آئیں گی وہ؟ ان کی آواز سنتے ہی وہ کھل اٹھتا۔ ہر طرف جیسے موسیقی سی بکھر جاتی۔ فون بند بھی ہو جاتا مگر ان کی آواز کی بازگشت مٹھاس بن کر اس کی سماعتوں میں رس گھولتی رہتی۔ ان کی آمد پر تو خوشی اس سے سنبھالے نہ سنبھلتی۔ ہر طرف پھول ہی پھول کھل اٹھتے۔ عجب مدھ ماتی سی فضا چھا جاتی جیسے کوئی اور ہی دنیا ہو اور ان کے جانے پر وہ یوں لٹا پٹا لوٹتا جیسے اس کا سب کچھ چھن گیا ہو، دنوں بولایا بولایا پھرتا۔

آہستہ آہستہ ان کیفیات میں شدت پیدا ہوتی جا رہی تھی لیکن اس نے انہیں کوئی نام دینے کی کوشش نہ کی۔

اس کے چھوٹے بھائی کی سالگرہ تھی۔ چاند چہروں، ستارہ آنکھوں کا میلہ تھا۔ وہ بھی شامل تھا۔ اس کی تعلیم مکمل ہونے والی تھی۔ اب تو امی خود اسکی شادی بیاہ کا ذکر کرنے لگی تھیں بلکہ انہوں نے تو یہ تک کہہ دیا تھا۔ ''رئیس! اب وقت ہے اگر تم کسی لڑکی کو پسند کرتے ہو تو مجھے بتا دو۔ میں تمہاری منگنی کر دوں گی اور پھر سال ڈیڑھ سال بعد شادی کر دیں گے۔''

''منگنی کی کیا ضرورت ہے، بس ایک بار ہی شادی کر لیں گے۔''

''میں تو تمہاری خوشی کے لیے کہہ رہی ہوں ورنہ بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔''

''اچھا تو پھر آرام سے مجھے سوچ کر اپنی پسند بتا دینا۔'' یہ کہتے ہوئے امی کے چہرے پر

بڑا روشن سا تفاخر تھا کہ وہ کتنی روشن خیال ہیں۔

وہ سوچنے لگا۔ باری باری سب لڑکیوں کے چہرے ذہن میں لایا، مگر پہلو میں مکمل خاموشی تھی۔ ہویدا جی کہتی تھیں، اصلی محبت تو ستاروں میں چاند کی طرح چمکے گی۔ وہ پھر سے نئے پرانے سب چہرے ذہن میں لایا اور وہ حیران رہ گیا کہ وہاں تو خود ہویدا جی چاند کی طرح چمک رہی تھیں۔ اس نے خود کو دلیلیں دیں۔ عمر اور رشتے یاد دلائے پھر بھی وہ چاند اسی طرح مسکراتا رہا۔ اس نے خود کو ہویدا جی کی ناراضی کا خوف دلایا مگر وہ چاند بدستور دمکتا رہا۔ پتہ نہیں کب وہ آہستہ آہستہ اس مقام پر قابض ہو گئی تھیں۔

مادی رشتوں سے بلند روح کی لطافتوں میں اترا ہوا یہ کیسا انوکھا رشتہ تھا لیکن اس حد تک سیراب کرنے والا کہ اس کی روح کی ساری پیاس بجھ گئی تھی۔ کسی کے لیے سب کچھ کر گزرنے اور کچھ بھی طلب نہ کرنے کی یہ کون سی منزل تھی کہ کسی خلا کا احساس نہیں تھا بلکہ ہویدا جی نے تو کوئی جگہ خالی چھوڑی ہی نہیں تھی کہ کسی اور کی گنجائش ہوتی۔ اس کے دل میں کوئی احساس جرم نہیں تھا۔ کوئی پچھتاوا، کوئی شرمندگی نہیں تھی۔ جب یہ سب کچھ بلا ارادہ بے اختیار ہو گیا تھا تو اس میں اس کی غلطی ہی کیا تھی۔

''ہویدا جی، اتنی پیاری اتنی اچھی ہیں کہ ان کو اچھی طرح جان لینے کے بعد نظروں میں کوئی اور جچتا ہی نہیں۔''

وہ پہلے اس انکشاف پر حیران ہوا اور پھر اعتراف کر کے سرشار سا ہو گیا۔ اب اپنی بے قراریاں، بیتابیاں اور خوشیاں اس کی سمجھ میں آنے لگیں۔

اب کے ہویدا جی کافی لمبے عرصے کے بعد آئیں اور وہ بھی صرف دو دن کے لیے، ویسے بھی ان کی مصروفیات اتنی ہوتی تھیں کہ رئیس کو بمشکل تھوڑا سا وقت ملتا اور وہ بھی اس لیے کہ انہیں کہیں آنا جانا ہوتا تو وہ چھوڑنے یا لانے چلا جاتا۔

اتنے دنوں بعد آئی تھیں اس نے ایک ایک پل ان کے انتظار میں گزارا تھا۔ اور وہ وہ تھیں کہ پتہ ہے کیا ہوا، پتہ ہے کیا ہوا...... سے شروع کر کر کے ادھر ادھر کی مزے مزے کی باتیں سنائے چلی جارہی تھیں۔ اسے بے چینی ہو رہی تھی۔ اور تب ایک انہونی ہو گئی۔ اس نے بھی انہی کے انداز میں کہا۔

''پتہ ہے، کیا ہوا ہویدا جی!''

انہوں نے اپنی گہری گہری آنکھیں اس کے چہرے پر گاڑ دیں اور پوری طرح متوجہ ہو گئیں اور رئیس براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

''مجھے معلوم ہو گیا ہے میرے دل کے آسمان پر چمکنے والا چاند کون ہے۔''

''اچھا......!'' انہوں نے اشتیاق سے کہا۔

''وہ چاند آپ ہیں ہویدا جی۔'' اس نے ایک دم سے کہہ دیا۔

ایک لمحے کے لیے ان کی آنکھوں میں کوئی بے نام کیفیت جاگی اور پھر وہ مسکرا دیں۔

''بڑوں کے ساتھ ایسا مذاق نہیں کرتے...... بری بات!''

''میں مذاق نہیں کر رہا، سچ بتائیں ہویدا جی! آپ کو کبھی اندازہ نہیں ہوا؟''

اور ہویدا کی آنکھوں کو دیکھ کر اسے جھیل پر اڑنے والا وہ پرندہ یاد آ گیا جو ہوا کے مخالف رخ پر اڑنا چاہتا تھا۔ وہ ڈگمگایا، ڈولا، پر پھڑپھڑائے اور پھر توازن قائم کر کے بڑی ہمواری سے اس مخالف سمت کو پرواز کر گیا تھا۔ بس ایک لمحے کے لیے اس پرندے کی طرح ان کی آنکھیں ڈگمگ ڈولیں، پلکیں جھپکیں، توازن قائم ہوا اور پھر وہ جم گئیں۔

بس اس لمحے کو اس نے اپنی زندگی کا حاصل بنا لیا۔ وہ لمحہ جب ان آنکھوں نے اقرار کیا تھا کہ وہ اس کے حال سے واقف ہیں۔ وہ لمحہ جب ان جھیلوں میں سوچ کے بجرے تیرے تھے، جب کوئی پنچھی ڈگمگ ڈولا تھا، کپکپایا تھا اور پھر توازن قائم کر کے مخالف رخ پہ اڑ گیا تھا۔

''یہ پاگل پن ہے۔''

''مجھے معلوم ہے۔''

''نہیں، تمہیں نہیں معلوم! جب تم کسی پیاری سی ہم عمر لڑکی سے پیار کرنے لگو گے، اس سے شادی کر لو گے تو تمہیں احساس ہوگا کہ یہ پاگل پن تھا، حماقت تھی۔''

''میں نے آپ سے کچھ مانگا تو نہیں ہویدا جی! بس یہ پاگل پن مجھے بہت پیارا ہے، یہی میرے لیے بہت ہے۔''

اور پھر وہ چلی گئیں۔

کچھ عرصے بعد ان کے اچانک انتقال کی خبر ملی۔ ان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ سب ان کے شوہر اور بچوں سے اظہار ہمدردی کر رہے تھے۔ مگر یہ کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ کہیں کسی اور کی بھی دنیا لٹ گئی ہے۔

چار خانہ دھوتی

سارا سوچتی، اس کی ماں اب بھی رات کے پچھلے پہر اس کی صحت، سلامتی اور درازی عمر کی دعائیں مانگتی ہوگی۔ اس بیچاری کو تو یہ تک نہیں معلوم کہ ایسی دعاؤں کے لیے باب قبولیت بند ہو چکا۔ اس کی بیوی اب تک تاریک راتوں کی سسکتی تنہائیوں میں گرم گرم آنسو اس کی یاد کی نذر کرتی ہوگی۔ وہ اب بھی اپنے دل کے مہمان کی آمد کا سندیسہ دینے کے لیے منڈیر پر بیٹھ کر بولنے والے کاگ کا انتظار کرتی ہوگی۔ اس کے بچے ابھی تک اپنی ماں سے پوچھتے ہوں گے کہ ان کا باپ ان کے لیے کھلونے اور مٹھائیاں لے کر کب آئے گا۔ کوئی نہیں جو امید کی لامتناہی ڈور سے بندھے، سسکتے، پل پل جیتے مرتے ان لوگوں کو انتظار کی سولی سے اتار دے۔ انتظار جو موت سے زیادہ شدید ہے۔ شاید اس طرح وہ صبر کا دامن تھام لیں، شاید انہیں قرار آ جائے، شاید گزرتا وقت......

گزرتا وقت...... اپنی ہی سوچ کی بازگشت اس کے ذہن میں گونجی۔ دن اور رات کے تسلسل اور ازل سے موجود و قائم وقت کو تو ہم گزرنے والا کہتے ہیں جبکہ خود افراد، قومیں اور سلطنتیں بیتتی چلی جاتی ہیں۔ ذہن انسانی کی اس قدیم شاطرانہ چال پر اسے ہنسی آ گئی۔ ویسے خود کو پل پل، گھڑی گھڑی بیتتے شمار کرنے سے تو اچھا ہے کہ وقت کو ہی بیتتا سمجھ لیا جائے۔ اور پھر یہ خود فریبی ہے بھی تو بہت اچھا بہلاوا۔

اور اس کی بھٹکتی ہوئی سوچ کا تسلسل پھر سے قائم ہو گیا۔ شاید گزرتا وقت ان کے زخموں کا مرہم بن جائے۔ نہیں شاید ایسا نہ ہو سکے۔ وہ جو اس کی کچھ نہیں لگتی، جس سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا، وہ ابھی تک اسے ذہن سے نہیں نکال پائی اور شاید تب تک اسے ہرگز نہیں بھلا پائے گی جب تک وہ اس بلڈنگ میں مقیم رہے گی۔

وہ پچھلے دو سال سے اس سات منزلہ بلڈنگ کے دوسرے فلور کے دائیں ہاتھ کے اپارٹمنٹ میں رہتی ہے۔ سینکڑوں کی تعداد میں پھیلی ہوئی ایک ہی وضع کی ان سات منزلہ عمارتوں کی تعمیر اس ناقابلِ یقین تیزی سے ہوئی تھی کہ لگتا تھا یہ راتوں رات اگ آنے والی کھمبیوں کی طرح زمین کے سینے سے پھوٹ پڑی ہیں۔ ان کی تعمیر کی رفتار کو دیکھ کر لگتا تھا کہ یہ کسی شدید ہنگامی ضرورت کے لیے بنائی جا رہی ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے کنکریٹ کا یہ جنگل اپنی پوری وسعت کے ساتھ زمین کے سینے پر پھیل گیا۔ پھر معلوم نہیں کیا ہوا کہ سالہا سال تک یہ عمارتیں بالکل خالی، بے آباد، ویران پڑی رہیں۔ شارع عزیزیہ سے گزرتے ہوئے ان پر نظر پڑتی تو خیال آتا کہ غالباً یہ عمارتیں یونہی کھڑے کھڑے کسی روز زمین بوس ہو جائیں گی۔

پھر اچانک اس بھوت بسیرے کے بھاگ جاگے اور حکومت نے انہیں آسان قسطوں پر عوام کے ہاتھوں فروخت کرنے کا اعلان کر دیا۔ ظاہر ہے یہ سہولت غیر ملکیوں کے لیے نہیں تھی۔ مقامی لوگوں نے دھڑا دھڑ اپارٹمنٹ خرید کر کرائے پر اٹھا دیئے۔ دوستوں، ملنے والوں سے ان فلیٹس کی تعریف سن کر وہ بھی اپنے پچھلے پندرہ برس کی رہائش گاہ چھوڑ کر یہاں اٹھ آئی۔ یہاں آ کر اسے کوئی پچھتاوا نہیں ہوا۔ اپارٹمنٹ بہت خوبصورت اور کشادہ تھا۔ علاقہ بھی صاف ستھرا اور نیا تھا۔ بلڈنگ کی صفائی پر مامور بنگالی لڑکا شریف پچاس ریال ماہوار لے کر گاڑی بھی صاف کر دیا کرتا اور پچاس ریال ماہوار کے اس ملازم سے بے وقت سودا منگوانے کی اضافی سہولت بھی میسر تھی جس سے بلڈنگ کے سبھی باسی فائدہ اٹھاتے۔

انہیں یہاں منتقل ہوئے ابھی چند ہی ماہ ہوئے تھے کہ ایک روز شریف اپنے ساتھ ایک اور بنگالی لڑکے کو لیے دروازے پر کھڑا تھا۔ ''ابی یہ ادھر کام کرے گا، گاڑی بھی دھوئے گا۔''

''تم کہاں جا رہے ہو؟'' اس نے پوچھا تھا۔

''بی بی گھر گئی، کوئی سنگا والا نہیں ہے، اپنے گھر جائے گا، بچوں کے پاس۔''

اس نے شریف سے اظہار افسوس کے بعد لڑکے کی طرف دیکھا تو لڑکے کے چہرے پر بڑی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''اچھا ٹھیک ہے۔'' مجھے کیا فرق پڑتا ہے...... اس نے سوچا تھا۔

لیکن اسے بہت فرق پڑا کیونکہ نئے لڑکے کی سمجھ میں تو کوئی بھی زبان نہیں آتی۔ وہ ہر بات کے جواب میں بڑا مخلص کی طرح سر ہلا دیتا اور ایک بے معنی سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل جاتی۔ معلوم نہیں اس کی عمر کیا تھی...... پچیس سال، تیس یا پینتیس سال۔ اس کی قامت و جسامت بھی تو ایسی تھی کہ کچھ اندازہ نہ ہوتا تھا۔ وہ دبلے پتلے جسم کا کوتاہ قد شخص تھا اور اس کے چہرے کے نقوش تو اسے اس لیے یاد نہیں تھے کہ وہ اسے کبھی دکھائی ہی نہیں دیئے تھے۔ اس کی وجہ اس کے چہرے کی وہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلی ہوئی مسکراہٹ تھی جس کی موجودگی میں باقی چہرے کی طرف دھیان ہی نہیں جاتا تھا۔

وہ سردیوں گرمیوں ایک ہی طرح کا لباس پہنتا تھا۔ سردیاں تو خیر یہاں آتی ہی کہاں تھیں۔ گرمیوں سے گرمیوں تک کے وقفے میں جو ایک آدھ مہینہ قدرے خوشگوار موسم آتا ہے، سب اسے سردیوں کا نام دے کر گرم سوٹ، مخملی کپڑے اور نفیس ولایتی سویٹر پہننے کا جواز پیدا کر لیتے۔ وہ سردیوں، گرمیوں آدھی آستین کی بش شرٹ اور دھوتی پہنتا تھا۔ پیروں میں ربڑ کی چپل ہوتی۔ بش شرٹ تو خیر وہ کبھی سادہ اور کبھی پھولدار پہن لیتا مگر دھوتی ہمیشہ چارخانہ ہوتی۔ بلڈنگ میں رہنے والے اسے ''چارخانہ دھوتی'' کہنے لگے۔ یہ سارا کو بہت ناگوار گزرا کہ ایک انسان کو اس کی شناخت سے ہی محروم کر دیا جائے۔ ٹھیک ہے وہ اپنا نام نہیں بتا پایا تھا لیکن اسے چوکیدار، حارس، خاکروب کچھ بھی کہا جا سکتا تھا، کم از کم ایک زندہ فرد۔

تقریباً ہر گھر میں شام کو کام کرنے والے ہاؤس بوائز جو مختلف قومیتیں اور زبانیں رکھتے تھے، ملی جلی عربی، اردو میں اپنا مافی الضمیر بیان اور روزمرہ کی بات چیت آسانی سے کر لیتے تھے۔ مگر اس نے کبھی ایک لفظ نہیں بولا تھا۔ ہاں سمجھنے بہتر طور پر لگا تھا۔ ہر بات کے جواب میں بس دائیں بائیں سر ہلا دیتا اور وہی اس کی مخصوص مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل جاتی تھی۔ قوت گویائی رکھنے والے اس گونگے کی عاجزو بے بس مسکراہٹ اسے ہر بار مغموم کر دیتی۔

شریف تو کام کاج سے فارغ ہو کر اکثر گھومنے یا اپنے دوستوں، ہم وطنوں کے پاس چلا

جایا کرتا تھا۔ مگر یہ کبھی کہیں نہ گیا۔ بس کبھی کبھار اپنے کمرے کے دروازے پر آ بیٹھتا اور آتے جاتے لوگوں کو دیکھتا رہتا۔

اسے اس طرح بیٹھے دیکھ کر اسے خیال آتا...... یہ محبتیں بھی کیسی ظالم ہوتی ہیں۔ خون میں رچی ہوئی، قطرے قطرے کے ساتھ رگ رگ میں گردش کرتی ہوئی۔ محبتیں، جن کی خاطر انسان سب کچھ کر گزرنے کو تیار ہوتا ہے۔ کچھ بھی کر گزرتا ہے۔ جن کی خاطر اس نے اور اس جیسے کتنوں نے بن باس لے لیا۔ اور بن باس بھی کیسا جس میں نہ تو لکشمن ہے نہ سیتا، دوہرا بن باس۔ اپنے دیس، اپنی زمین، اپنی فضاؤں سے بن باس...... پھر تنہائی، محرومی اور بے کسی کا بن باس۔

اور یہ پیٹ کی آگ بھی کیسی ظالم ہوتی ہے...... خون کے رشتوں کی محبت پر بھی غالب آ جاتی ہے۔ جنگ سے، طوفانوں سے، بھڑکتے شعلوں سے زیادہ ظالم، حکمران آگ، آمر آگ...... جس کے آگے ہتھیار ڈال کر اس کی ماں نے اپنے جگر گوشے کو خود سے جدا کر دیا۔ بیوی نے برہا اگن میں جلنا منظور کر لیا۔

اس نے رضا کارانہ طور پر کئی کام اپنے ذمے لے لیے تھے جو آہستہ آہستہ اس کے فرائض میں داخل ہو گئے۔ وہ بلڈنگ میں سب کو گیس کے سلنڈر اور پانی کے کین لا دیتا۔ کہیں باہر سے آؤ تو نظر پڑتے ہی چہرے پر وہی مسکراہٹ لیے لپک کر آتا اور دوڑ کر سامان اٹھا لیتا۔ بھاری سامان اٹھا کر بیرونی گیٹ کی تین سیڑھیاں چڑھتے میں چار خانہ دھوتی میں سے دکھائی دیتی کمان کی طرح مڑی ہوئی پنڈلیوں والی اس کی پتلی پتلی ٹانگیں کپکپا جاتیں مگر وہ چشم زدن میں لفٹ کے ذریعے سامان لے جا کر گھر کے دروازے پر رکھ آتا۔ اسے ہر ایک کے گھر کی پہچان تھی۔

اس کی اپنی رہائش، بلڈنگ کے بیرونی دروازے کے ساتھ بنا ہوا چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں پورے قد کا آدمی کھڑا بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ دراصل یہ بلڈنگ کا کوڑے دان تھا جس کے ہر منزل سے ہوتے ہوئے نیچے تک پہنچتے ہوئے سوراخ کو بند کر کے اور سامنے کے کھلے حصے پر آہنی گیٹ لگا کر نیچی چھت کے چھوٹے سے کمرے میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ نہانے دھونے اور دیگر جملہ ضروریات کے لیے وہ قریبی مسجد کی سہولیات استعمال میں لاتا۔ کوڑے دان کو

چوکیدار یا خاکروب کی رہائش میں تبدیل کر دینے پر کوئی بھی معترض نہ تھا کہ اول تو وہ کوڑا ہر گھر سے خود اکٹھا کر کے لے جاتا اور دوسرے دن رات بلڈنگ میں اس کی موجودگی وقت بے وقت کام بتانے کی اضافی سہولت مہیا کرتی تھی۔

ایک روز اس کی کوٹھری کا دروازہ کھلا تھا تو سمارا نے دیکھا کہ اس نے کوٹھڑی کو بڑے سلیقے سے سنوار کر رکھا ہوا تھا۔ سامنے کی دیوار کے ساتھ گدا بچھا کر بستر لگا رکھا تھا۔ سرہانے ٹیپ ریکارڈ پڑا تھا، اس کی تنہائی کا ساتھی، اس کا پیامبر۔ پہلے اسے اس بات پر ہنسی آتی تھی کہ جو بھی مستری، مزدور بیرون ملک آتا ہے، سب سے پہلے ٹیپ ریکارڈر خریدتا ہے۔ چھٹی جاتے ہوئے بھی ہر ایک کے ہاتھ میں ٹیپ ریکارڈر ضرور ہوتا ہے۔ ''یہ بھی بھلا کوئی ایسی چیز ہے جو ضروریات زندگی میں سب سے اہم ہو۔'' وہ سوچتی...... لیکن یہ تو اسے بعد میں پتہ چلا کہ واقعی اس کی ان کی زندگی میں کتنی اہمیت ہے۔ بیچارے پڑھے لکھے تو ہوتے نہیں، کسی سے خط لکھوا کر اپنے گھر کے حالات اور دل کا حال دوسرے کو بتانے سے یہ بہتر ہے کہ وہ سب باتیں ریکارڈ کر کے گھر بھیج دیں۔ اسی طرح گھر والے بھی جوابار یکارڈ بھیجتے رہتے ہیں۔

اس کے بستر کے سرہانے ٹیپ ریکارڈ اور پاکستانی ٹین کا پھولدار ٹرنک رکھا تھا۔ دوسرے کونے میں گیس کا چھوٹا سا سلنڈر اور سٹو و تھا۔ پاس ہی ضرورت کے چند برتن تھے۔ دیوار پر آئینہ ٹنگا تھا جس کے ارد گرد نقلی پھولوں کی بیل لپٹی ہوئی تھی۔ چھوٹا سا ائیر کنڈیشنر بھی لگا ہوا تھا۔ ممکن ہے کوئی چھوٹا ٹی وی بھی ہو۔ اس نے تو بس ایک نظر دیکھا تھا۔

جب یہ اپنے گھر والوں کو بتاتا ہوگا کہ وہ ائیر کنڈیشنڈ کمرے میں رہتا ہے، اس کے پاس گیس کا چولہا، ٹیپ ریکارڈ اور ٹی وی ہے تو اس کے گھر والے کتنے خوش ہوتے ہوں گے اور جب وہ پر غرور انداز میں اس کا ذکر اپنے ملنے جلنے والوں سے کرتے ہوں گے تو ان لوگوں کو اس کی قسمت پر کیسا کیسا رشک نہ آتا ہوگا۔

پھر ایک روز سیڑھیوں پر سے کچھ لڑھکنے اور گرنے کی ملی جلی آوازیں آئیں۔ دوپہر کا وقت تھا، مرد کام پر گئے ہوئے تھے، بچے سکولوں میں گئے ہوئے تھے، صرف عورتیں گھروں میں تھیں۔ کسی نے زیادہ پرواہ نہ کی کیونکہ بڑا فرنیچر جو لفٹ میں نہیں جا سکتا تھا اس کی منتقلی سیڑھیوں کے ذریعے ہوتی تھی۔ مگر جب آواز گونجتے گونجتے اس کے فلور میں آ کر رک گئی تو

اس نے اور سامنے کے اپارٹمنٹ والی نے ایک ساتھ اپنا دروازہ کھولا تو سامنے کا منظر ان کے حواس گم کردینے کے لیے کافی تھا۔ سامنے وہ خون میں لت پت پڑا تھا۔ خون اس کے سر سے نکل رہا تھا۔ بالٹی پر اس کے ہاتھ کی گرفت اب بھی مضبوط تھی جس میں وائپر اٹکا ہوا تھا۔ کسی نے پولیس کو فون کردیا۔ آن کی آن میں ایمبولینس بھی آ گئی مگر اس کی خاموشی ہمیشہ کے لیے سکوت میں بدل چکی تھی۔ پردیسی نے دور دیس کی راہ لی تھی۔

اس کی لاش تقریباً دو مہینے پولیس کی تحویل میں سرد خانے میں پڑی رہنے کے بعد دفن کر دی گئی۔ معلوم ہوا کہ اس کا ویزہ جعلی تھا اور اس میں فراہم کردہ اطلاعات اور پتہ فرضی تھا جس پر رابطہ ناممکن تھا۔

ہفتے بھر کے اندر اندر نئے خاکروب اسلم نے اس کی جگہ لے لی جو نہ اس کی طرح تنہائی پسند تھا اور نہ ہی اس کی طرح رضاکارانہ کام کرتا تھا۔ کچھ عرصے تک سب اسے یاد کرتے رہے مگر آخر عادی ہو گئے۔

آج جب وہ چھٹی گزار کر واپس آئے اور ٹیکسی بلڈنگ کے دروازے پر رکی تو سمارا کو پھر وہ یاد آ گیا کہ کیسے کار رکنے کی آواز سن کر وہ لپک کر باہر آتا اور سامان اٹھا کر لے جاتا تھا۔ وہ محنتی، گمنام شخص، وہ جس کے بچے مٹھائیاں اور کھلونے لے کر آنے والے باپ کا انتظار کرتے ہوں گے، جس کی بیوی تاریک راتوں کی تنہائیوں میں چپکے چپکے گرم آنسو اس کی یاد کی نذر کرتی ہوگی اور جس کی ماں رات کے پچھلے پہر اس کی درازی عمر اور سلامتی کی دعائیں مانگتی ہوگی، اس بات سے بے خبر کہ ایسی دعاؤں کے لیے باب قبول کب کا بند ہو چکا۔

''بیچارہ'' اس نے خود کلامی کے انداز میں زیر لب کہا۔

''کون؟'' اس کے شوہر نے پوچھا۔

''چارخانہ دھوتی'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکل گیا۔

وہ شہر

عجیب شہر تھا وہ جہاں صرف لباس رہتے تھے۔ انواع واقسام کے لباس، غیر ملکی، درآمد شدہ لباس، اعلیٰ لباس، متوسط لباس، ادنیٰ لباس، بوسیدہ لباس، دریدہ لباس۔ ان لباسوں میں انسانی جسم بھی تھے مگر وہ تو صرف لباسوں کو متحرک اور فعال رکھنے کے لیے تھے، ان کی کوئی شخصیت کوئی شناخت نہ تھی۔ اصل باسی تو وہ لباس تھے جو پوری تندہی اور سرگرمی سے کاروبار حیات میں مصروف تھے۔

اور یہ وہ شہر تھا جہاں اس کی ہستی کی کلی پھوٹی تھی، جہاں اس کا بچپن کھیلا تھا، جہاں اس کا شباب کھلا تھا۔ وہ تو اس شہر کے ہر گلیارے، ہر کوچے، راستوں کی ہر ہر اینٹ پتھر اور گڑھوں تک کو پہچانتا تھا۔ جہاں سب اپنے تھے اور کوئی غیر نہ تھا اور جب اس نے اس شہر کو چھوڑا تھا تو بھی یہ شہر کہاں اس سے چھوٹا تھا۔ وہ تو سدا اس کے ذہن میں آباد رہا تھا۔ وہ تمام دن روزگار و معاش کی تگ و دو میں گزارنے کے بعد جب رات کو سوتا تو انہی گلی کوچوں میں جا نکلتا......
انہی سنگیوں ساتھیوں کے ساتھ۔

رات کے علاوہ دن کو بھی وہ یہی خواب بنتا رہتا کہ جیسے ہی وہ ایک خوشحال زندگی گزارنے کے لیے بھاری رقم جمع کرلے گا، اپنے خوابوں کے شہر کو لوٹ جائے گا۔ وہیں آباد ہونے کے لیے۔ وہ اپنے اس گھر کو نئے سرے سے تعمیر کرے گا۔ جس کی پرانی چھت گرنے

سے اس کے ماں باپ اور چھوٹی بہن تینوں ایک ساتھ چل بسے تھے، جبکہ وہ اکیلا اس لیے بچ گیا تھا کہ وہ گھر پر تھا ہی نہیں۔ وہ اس رات اپنے دوستوں کے ساتھ بٹیروں کے شکار کے لیے گیا ہوا تھا اور وہ سب سوتے میں ہی ہمیشہ کے لیے سو گئے تھے۔

وہ اس کھنڈر کو پھر سے نئی شکل دے گا جس میں اس کی زندگی کی بہترین یادیں دفن تھیں۔ اس نے اپنی زندگی کی ساری خوشیاں اور مستقبل کے سارے خواب اس شہر سے مشروط کر دیئے تھے۔

اور دس سال بعد وہ یوں سیدھا اس شہر کو لوٹا جیسے پرندے صبح کو رزق کی تلاش میں نکلتے ہیں اور شام پڑتے ہی اپنے آشیانے کا رخ کرتے ہیں۔

وہ کل رات ہی اس شہر میں پہنچا تھا اگرچہ کافی بدل گیا تھا مگر وہ بغیر کسی وقت کے اپنے بچپن کے دوست کے گھر پہنچ گیا۔

اس کے دوست نے دروازہ کھولا۔ دونوں کو ایک دوسرے کو پہچاننے میں کچھ دیر لگی۔ وہ اسے اندر لے گیا مگر اس کے رویے میں وہ محبت اور گرم جوشی نہیں تھی جس کی حدت سے وہ خود تپ رہا تھا۔ شاید وہ کچی نیند سے جاگا اس لیے...... اس نے خود کو تسلی دی۔

اس کا دوست سو گیا لیکن اس کے لیے اس رات کی صبح کرنا مشکل ہو گیا اور مرغ کی پہلی اذان کے ساتھ پو پھٹتے ہی وہ نکل کھڑا ہوا۔

ہر اینٹ پتھر، گلی کوچے، پیڑ پودے، پھول پتے سے ملنے، پھر دن نکل آیا۔ وہ سارا دن بھٹکتا رہا۔ گلیوں میں، سڑکوں پر، بازاروں میں اور دن ڈھلے شکستہ دل و شکستہ پا لوٹ آیا۔

اس کے دوست نے اس سے اداسی کا سبب پوچھا تو وہ رو دیا۔ اس نے بتایا کہ پورے شہر میں کسی نے اسے آنکھ اٹھا کر دیکھا تک نہیں۔ پہچاننا تو درکنار۔ اتنی اجنبیت تو اسے پردیس میں محسوس نہیں ہوئی تھی جتنی اس شہر میں ہوئی ہے جو اس کے باپ دادا کا تھا اور ان کے آباء واجداد کا تھا۔ اور اسے ہر جگہ مردوں کی سڑاند جیسی بو آتی تھی۔

یہ سب سن کر اس کا دوست ہنسا۔ عجیب کھوکھلی ہنسی تھی، غیر انسانی ہنسی۔

وہ اس کی ہنسی سے ڈر گیا اور پھر سے رونے لگا۔

اس کا دوست بولا۔ ''تو کیوں بھولتا ہے کہ تو دس سال بعد آیا ہے اور اب اس شہر کا مزاج

بدل گیا ہے۔"

وہ اسی دل گرفتگی سے بولا۔"میں روپیہ کما کر اس لیے اپنے شہر لوٹا تھا کہ سکون سے اپنوں میں رہ سکوں۔"

"تیرے پاس روپیہ ہے۔" اس کے دوست کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔

"پھر تو کوئی مشکل نہیں، تو بھی قیمتی لباسوں میں داخل ہو جا اور یہی تیرا تعارف ہوگا۔"

اس نے ویسا ہی کیا جیسی اس کے دوست نے نصیحت کی تھی۔

وہ جہاں گیا اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ بڑی عزت و تکریم دی گئی اور ان لوگوں نے بھی جان پہچان کا دعویٰ کیا جنہیں وہ بالکل نہیں جانتا تھا۔

وہ شام کو خوش خوش گھر لوٹا اور دوست کو دن بھر کی روداد سنائی۔

"کیا تجھے آج بھی مردوں کی سڑاند کی بو آئی؟" دوست نے پوچھا۔

"شاید نہیں۔" اس نے دماغ پر زور دے کر سوچتے ہوئے کہا۔

اس کا دوست زور سے ہنسا۔

وہ بھی اس کی ہنسی میں شامل ہو گیا۔

اور اب ان دونوں کی ہنسی ایک جیسی تھی۔

دلِ صد پارۂ خویشم

''ائیر کنڈیشنڈ ذرا کم کر دو۔'' روشین نے اپنے یخ ہوتے ہوئے بازوؤں کو دباتے ہوئے ڈرائیور سے کہا۔ پھر اس نے پردو سر کا کر ٹنٹڈ گلاسز میں سے باہر دیکھتے ہوئے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ وہ کس علاقے سے گزر رہے ہیں۔

''اچھا! یہ تو دلنواز کنج ہے، کیوں نہ فیض بھائی کا گھر بھگتاتی چلوں۔'' اس نے سوچا۔

دنیا کہاں سے کہاں جا پہنچی تھی۔ مادی ترقی اور روحانی انحطاط ایک ہی رفتار سے بڑھ رہے تھے۔ وہ سمجھ نہ پائی، ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ مادی ترقی کا لازمی نتیجہ روحانی انحطاط ہو یہ ہرگز ضروری نہیں تھا۔ اقدار کی اتنی تیزی سے تنزلی اسے بہت پریشان کرتی اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا۔ مغربی دنیا میں اقدار کی تنزلی کا الزام ہم سائنسی ترقی کو دیتے ہیں گویا یہ ترقی کا منطقی انجام ہو مگر اس کو کیا کہیے کہ مشرقی دنیا کے چھوٹے چھوٹے قصبوں اور دیہاتوں میں جہاں زندگی کی بنیادی ضرورتیں بھی بمشکل تمام میسر تھیں وہاں بھی لوگوں میں وفا کی خوبو کم ہوتی جا رہی تھی اور اخلاص و مروت کی جگہ خود غرضی اور بے مروتی سے بدلتی جا رہی تھی۔ وہ سوچتی۔

اور وہ خود اس خیال کو غلط ثابت کرنے کے لیے ہلکان ہوئے جا رہی تھی۔ روشین نے اس سلسلے میں اپنی خود ساختہ ذمہ داریاں اس قدر بڑھا لی تھیں کہ وہ ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے خود کو تباہ کیے دے رہی تھی۔ وہ سال چھ مہینے بعد وطن لوٹتی تو قریب و دور کے سب

رشتہ داروں حتیٰ کہ جان پہچان کے لوگوں سے جا جا کر ملتی، محبتیں نچھاور کرتی اور ہر طرح سے کام آتی جسے وہ اپنا حق سمجھ کر وصول کرتے اور کمی بیشی ہونے کا گلہ کرتے جس کے لیے وہ بڑی عاجزی سے معذرتیں کرتی اور صفائی پیش کرتی...... اب ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ اسے کچھ زیادہ ہی اچھا سمجھ کر سر پر چڑھا لیتے۔ وہ اس کے رویے میں اس کی غیر موجودگی میں معانی اور اغراض تلاش کرنے کی کوشش کرتے اور جس میں وہ اکثر کامیاب بھی ہو جاتے۔ ایسی کئی باتیں اس کے علم میں بھی آتیں۔ اسے رنج تو ہوتا مگر وہ سوچتی کہ ضرور اس کے خلوص میں کچھ کمی ہے اور وہ اور شدت سے اپنے مشن میں جٹ جاتی جس کا تاوان اسے جسمانی ابتری اور اعصابی شکستگی کی صورت میں ادا کرنا پڑتا۔ وہ ابھی تک تو مایوسی کے اس جہنمی منطقے میں داخل نہیں ہوئی تھی جہاں حقیقتوں کی سنگلاخ زمینوں پر بے مہر سورج سوا نیزے کی بلندی پر اتر آتے ہیں۔ ابھی اسے یہ خیال بھی نہیں آیا تھا کہ اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔ ابھی تو وہ اس خیال میں مگن تھی کہ اسے تو وہ گوشہ منور کرنا ہے جہاں اس کا قیام ہوگا۔ اسے تو اس زمین میں پھول بونے ہیں جہاں جہاں اس کے قدم پڑتے تھے۔

لیکن شاید اس تلخ حقیقت سے وہ خود بھی آگاہ نہ تھی کہ مسلسل منفی رویے اس کے اندر بھی غیر محسوس طریقے سے تبدیلی لا رہے تھے اور اب خلوص و محبت کی شدت مروت و وضعداری میں بدلتی جا رہی تھی۔ اب یہی دیکھو وہ بہت سے لوگوں سے ملاقات کو بھگتانے کے زمرے میں رکھنے لگی تھی۔ ''فیض بھائی کا گھر بھی بھگتاتی چلوں۔''

فیض بھائی اس کے پھوپھی زاد تھے لیکن سگے بھائیوں سے زیادہ مان دیتے تھے اور راشدہ بھابی ان سے بڑھ کر۔ وطن میں قیام کے دوران ان کا گھر اس کی مستقل جائے رہائش ہوتا تھا اور باقی ہر جگہ آنا جانا رہتا تھا۔ دونوں میاں بیوی اس کی خاطر داری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے۔ اور یہ خاطر داریاں ہی کچھ ان کے ہاں وجہ قیام نہ تھیں۔ بے شک! اس شہر میں اس کے اور بھی کئی قریبی رشتہ دار تھے۔ مگر فیض بھائی کے گھر کی گرم جوش اور محبت بھری بے تکلف فضا اسے بہت بھاتی تھی۔ فیض بھائی کے بچوں سے بھی اس کی خوب دوستی تھی۔ خوب مل جل کر ہلا گلا کرتے، خود وہ بھی بہت زندہ دل تھی۔ اس گھر کا ماحول اس کے مزاج سے مطابقت رکھتا تھا اس لیے یہاں رہنا پسند تھا۔

دن رات ایک کر دینے والی اعصاب شکن مصروفیات کے بعد جب وہ گھر لوٹتی تو ان کے شوخ جملے اور دلچسپ باتیں اسے تازہ دم کر دیتیں۔

''پھپھو! آپ اپنی موم بتی کو دونوں سروں سے جلا رہی ہیں۔'' احمد جان بوجھ کر لفظی ترجمہ کرتا۔

''روشنی بھی تو زیادہ ہوتی ہے نا۔'' وہ کہتی۔

''ختم بھی تو جلدی ہو جاتی ہے۔'' وہ گویا سمجھانے کی کوشش کرتا۔

''اس کے بجھنے سے پہلے تم اس سے اور شمع روشن کر لینا۔''

''نا بابا، ہم میں اتنا دم نہیں۔ میں تو بس آپ کے لیے فکر مند تھا۔ میرا مشورہ ہے کہ ایک سرا بہت ہے جلانے کو۔''

وہ اداس ہو جاتی۔

وہ جھوٹ موٹ کیمرہ پکڑ کر تصویر اتارنے کی ایکٹنگ کرتا اور پھر چیز (Cheese) کا لفظی ترجمہ کرتے ہوئے کہتا۔ ''پنیر''

اور اسے ہنسی آ جاتی۔ ایک ایک کر کے سب جمع ہو جاتے اور پھر محفل جم جاتی جو اکثر رنجگوں میں ڈھل جاتی اور اب وہی گھر بھگتانے والی فہرست میں آ گیا تھا۔ آج کل اس کا قیام طاہرہ آپا کے ہاں تھا، فیض بھائی کی سگی بہن۔ یوں جائے قیام بدلنے کا فیض بھائی اور راشدہ بھابی کو قلق تو تھا، مگر انہیں احساس تھا کہ روشین حق بجانب تھی۔ اس نے بے حساب بکھیڑے پالے ہوئے تھے اور اب وہ اس کو لانے پہنچانے کی وہ سہولت مہیا نہیں کر سکتے جو اسے درکار تھی۔

بات صرف اتنی نہیں تھی گاڑی اور ڈرائیور کا تو وہ مہینے بھر کے لیے بندوبست کر سکتی تھی۔ اصل میں اسے اب فیض بھائی کے ہاں عجیب سی گھٹن کا احساس ہوتا اسی لیے تو اس کی ملاقاتوں کا دورانیہ مختصر ہوتا جا رہا تھا اور یہ تبدیلی تب سے آئی تھی جب سے فیض بھائی کے بڑے بیٹے ارشد کو کینسر ہو گیا تھا۔ دو ہی تو بیٹے تھے بڑا ارشد اور چھوٹا احمد۔

کسی ان لکھے ان کہے معاہدے کے تحت ان کے ہاں ارشد کی بیماری کا ذکر کبھی کوئی زبان پر نہ لایا جاتا۔ سب حسب معمول ہنستے مسکراتے، بولتے چالتے اور سب سے بڑھ کر خود ارشد لطیفوں پر لطیفے سناتا۔ سب ہنستے لیکن ہنسی صرف ان کے گلے سے نکلتی، دل سے نہیں۔ گو بظاہر

کوئی کچھ بھی نہ کہتا لیکن تنی ہوئی سی فضا میں غموں اور اندیشوں کے غیر مرئی ہیولے گردش کرتے رہتے۔ اس کے علاوہ وہاں ایک اور احساس بھی اسے گھیر لیتا جس کی کوئی وجہ اس کی سمجھ میں نہ آتی۔ گو بظاہر کچھ بھی نہ بدلا تھا گھر وہی تھا، فرنیچر وہی تھا، گھر والوں کا پہناوا وہی تھا مگر ہر چیز سے ایک خستگی و شکستگی سی ٹپکتی اور وہ بے کل ہو جاتی۔ ہاتھ کان میں پہنے ہوئے زیور جیسے جلد میں گڑنے سے لگتے اور یہ احساس اتنی شدت اختیار کر لیتا کہ وہ زیور اتار کر پرس میں رکھ لیتی۔

''کیوں اتار دیئے ہیں؟ پیاری لگ رہی تھیں۔''

''لگتا ہے مجھے الرجی ہو گئی ہے۔ یہاں کچھ پہنا ہی نہیں جاتا۔'' وہ اپنی سرخ ہوتی ہوئی کلائیوں کو کھجاتے ہوئے کہتی۔ اسے سچ مچ جلن ہونے لگتی۔

جب وہ جلتی دوپہر میں ان کے گھر پہنچی تو وہ حیران بھی ہوئے اور خوش بھی۔

''آپ باز نہیں آئیں گی پھپھو، اپنی موم بتی کو دونوں سروں سے جلانے سے۔'' احمد حسب عادت بولا۔

''جلدی ختم......'' اور کمرے میں موجود چاروں لوگوں کے اعصاب تن گئے۔ ''ارے اتنی گرمی میں آئی ہوں، پہلے پانی وانی تو پوچھ لو...... یزیدوں کا گھر ہے کیا؟'' اس نے بات بدلی حالانکہ نہ وہ پیاسی تھی اور نہ گرمی سے آئی تھی۔

''آج رکو گی نا؟'' راشدہ بھابی نے پوچھا۔

''نہیں بھابی! بہت کام ہیں، ادھر سے گزری تو سوچا جھانکتی چلوں۔''

''اچھا کیا، اچھا کیا۔'' فیض بھائی نے شفقت سے کہا اور پھر نا کچھ پوچھے ایک دم سے بولے۔ ''روشی بیٹے، بھائی کے لیے دعا کرو۔''

پچھلے دو سالوں میں بیماری کی تشخیص کے بعد سے آج پہلی بار ایسا ذکر ہوا تھا اور وہ بھی ارشد کی موجودگی میں۔

''حالت بہت خراب ہے......'' انہوں نے بات جاری رکھی۔ روشین سٹپٹا گئی اور گھبرا کر ارشد کو دیکھا جو گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بظاہر بڑی لاتعلقی سے کرکٹ میچ دیکھ رہا تھا اور فیض بھائی میڈیکل ٹرمز میں بلڈ کاؤنٹس وغیرہ بتانے لگے۔ اب اس نے گھبرا کر بھابی کو دیکھا مگر بھابی بھی بظاہر کچھ کاڑھنے میں مصروف رہیں۔

''اب تو دل پر بھی اثر ہونے لگا ہے، جگر کا بھی برا حال ہے اور تلی......''

اس کا دم الجھنے لگا۔ اس نے پھر سب کو باری باری دیکھا مگر سب اپنے اشغال میں منہمک رہے جیسے فیض بھائی کی آواز کوئی ایسی طلسماتی آواز تھی جسے صرف وہی سن سکتی تھی ادھر فیض بھائی تھے کہ پوری بیدردی بلکہ سفاکی سے پوری تفصیل بیان کیے چلے جارہے تھے......

''اور اب بلاسٹ سیلز''

اور اسے لگا وہ بلاسٹ ہو جائے گی۔ وہ ایک دم ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''چلتی ہوں، اس وقت مجھے جلدی ہے...... پھر آؤں گی۔'' اس نے بھی بظاہر نارمل اور پرسکون نظر آنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ وہ سب اسے الوداع کہنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''کسی کو باہر تک آنے کی ضرورت نہیں، بہت گرمی ہے۔'' روشین بولی اور جلدی سے دروازے سے نکل گئی۔ اس کی بات ان سنی کرتے ہوئے فیض بھائی بھی ساتھ نکل آئے۔ بیرونی گیٹ کے قریب پہنچ کر فیض بھائی ایک بار پھر بولے۔

''دعا کرو روشی بیٹے''

روشین نے نظریں اٹھائیں تو فیض بھائی کی آنکھوں کے صحرا میں ایک سوال بگولے کی طرح چکرا رہا تھا اور لب یوں پھڑ پھڑا کر رہ گئے تھے جیسے ان کی آواز کھو گئی ہو اور وہ کھوئی ہوئی آواز...... اس کے اندر جا کر شور مچانے لگی۔ شور بڑھتا گیا، بڑھتا گیا...... صرف ایک آواز...... ایک صدا...... اور پھر پوری کائنات اس آواز، اس صدا کی گونج سے لبریز ہو گئی۔

من قاش فروش دلِ صد پارۂ خویشم

وہ ماؤف ذہن اور ساتھ چھوڑتے حواس کے ساتھ جلدی سے گاڑی کی سیٹ پر ڈھے سی گئی۔ اسے لگا وہ پاتال میں گرتی چلی جارہی ہے، نیچے اور نیچے...... یہ اس نے کیا کیا...... کیوں آیا یہ دن...... کیوں آنے دیا اس نے یہ وقت...... وہ اتنی اندھی کیوں ہو گئی تھی...... اور...... اور تبھی ایک ڈوبتی سی...... کہیں دور سے...... ایک بے صدا سی آواز ابھری اور چند لفظ جیسے ٹوٹ کر گر پڑے۔

''اگر ہو سکے تو......؟''

اس نے بمشکل وقت نظر اٹھائی۔ فیض بھائی کی وقت سے پہلے سفید ہوتی داڑھی میں چند شفاف موتی اٹک گئے تھے۔

ہاں! وہ ان کے دل کے ٹکڑے ہی تو تھے۔ جب مادے کی کثافت ختم ہو جاتی ہے تو وہ لطیف، شفاف اور بے رنگ ہو جاتا ہے نا!

بھاگیہ شالی

''ارے اب میں اٹھارہ انیس برس کی لڑکی تو ہوں نہیں کہ پیار محبت کے چکروں میں پڑی رہوں۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ پتی پتنی کے بیچ کتنی انڈرسٹینڈنگ ہے، کتنی ٹولرینس ہے۔ یقین کرو ہم میں اتنی انڈرسٹینڈنگ ہے کہ امیت نے آج تک مجھ سے کوئی حساب نہیں لیا۔ کہیں آنے جانے پر کوئی پابندی نہیں لگائی۔ جہاں آؤں جاؤں جسے لوں دوں جو چاہے کروں۔ آفرین ہے ان کی ظرف پر کبھی بھول کر جو پوچھا ہو کہ کیا کرتی ہے، کیا نہیں۔''

اب میں عام عورتوں کی طرح تو ہوں نہیں کہ اسی بات کو مسئلہ بنالوں کہ وہ میرے ساتھ کہیں آتے جاتے نہیں۔ ان کی اپنی مصروفیات ہیں اور پھر وہ یہ سب کچھ ہمیں اتنی آرام دہ زندگی مہیا کرنے کے لیے ہی تو کر رہے ہیں۔ صرف ہمارے نہیں بلکہ معلوم نہیں کتنے خاندانوں کے کفیل ہیں اور کتنے لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔ اتنے دیالو ہیں فینا کہ پوچھو مت۔ ایسا کون ہوگا آج کل کے زمانے میں سبھی اپنی غرضوں سے بندھے ہیں اور وہ ہیں کہ بے غرض و بے صلہ سب کے لیے اپنے دن رات ایک کئے دے رہے ہیں۔ کون بدقسمت فخر نہیں کرے گی ایسے پتی پر۔ اور یہ بھی تو دیکھو فینا کہ اتنا ہونے کے باوجود کوئی بری عادت نہیں۔ نہ سگریٹ، نہ شراب اور نہ ہی اور کوئی بری لت۔

دوسروں کے دکھ درد کا اتنا احساس کہ ذرا کسی کے کانٹا بھی چبھے تو تڑپ یہ اٹھیں۔ اپنے

ادنیٰ سے ادنیٰ ملازم کے دکھ، بیماری پر یوں تڑپ اٹھیں گے جیسے کوئی اپنا ہو، فوراً اچھے سے اچھے ڈاکٹرز سے اچھے سے اچھے ہسپتال میں علاج کرائیں گے۔ دوستوں کے بیوی بچوں کی ان کی غیر حاضری میں یوں خبر گیری کریں گے کہ کوئی اپنوں کی نہ کرتا ہوگا۔ اتنی ذرا ذرا سی بات کا خیال کہ میں تو اس شخص کے احساس پر حیران رہ جاتی ہوں۔ کیسا ہمدرد دل پایا ہے کیسا حساس ہے یہ۔

فینا اب میں کوئی جاہل عورت تو ہوں نہیں کہ یہ سوچوں کہ وہ ایسا میرے لیے کیوں نہیں سوچتے۔ میرے پاس گاڑی ہے ڈرائیور ہے پیسہ ہے۔ بچوں کا اور اپنا دکھ سکھ میں خود دیکھ بھال سکتی ہوں۔ جس ڈاکٹر کے پاس جاؤں جس ہسپتال میں جاؤں۔ جتنا پیسہ چاہوں خرچ کروں میری مرضی ہے۔ انہوں نے کبھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ارے فینا، اپنے لیے اپنے کنبے کے لیے تو ساری دنیا کرتی ہے۔ بڑائی تو اس میں ہے نا کہ دوسروں کے لیے کیا جائے اور اپنوں سے بڑھ کر کیا جائے۔

سچ فینا، میں تو جتنا سوچتی ہوں میری حیرت بڑھتی جاتی ہے کہ اس شخص کا کردار کتنا بلند ہے۔ یہ تو پوجا کے لائق ہے پوجا کے۔ ایسے سائنسی دور میں تم نے ایسی اولاد کاہے کو دیکھی ہو گی کاروبار، دوست یار۔ بیوی بچوں کے ہوتے ہوئے ماتا پتا کا ایسا فرمانبردار کہ ان کی ایک کراہ پر سوتے سے تڑپ کر اٹھے۔ ماتا جی بھگوان ان کی عمر ہزاروں برس کرے اب اسی (۸۰) کے پیٹے میں ہیں۔ پرسوں رات گھر پہ دعوت تھی، رات کے کھانے پر کچھ زیادہ کھا لیا تو گیس کی تکلیف سی ہوگئی ان کے تو ہاتھ پیر پھول گئے۔ سسر جی نے بہتیرا منع کیا کہ بیٹا بڑھاپا ہے ہمارا۔ تھوڑی بہت گڑ بڑ تو رہتی ہے۔ ابھی سونف چبالیں گی یا پودینہ الا پچی کا قہوہ پی لیں گی تو اچھی ہو جائیں گی، طبیعت سنبھل جائے گی۔ مگر ان کی گھبراہٹ کم نہ ہوئی الٹا باپ سے الجھنے لگے کہ آپ کو ماتا جی کا کچھ خیال ہی نہیں۔ اسی وقت ایمرجنسی میں لے کر دوڑے آدھی رات کو۔ میں بھی ساتھ ہولی ڈاکٹروں نے بہتیرا کہا کہ فکر کی کوئی بات نہیں لیکن ان کی تسلی نہ ہوئی اور سارے ٹیسٹ کروائے۔ رات بھر ماتا جی ہسپتال میں رہیں میں بھی ان کے ساتھ رہی۔ اب میں کوئی چھوٹے ذہن کی عورت تو ہوں نہیں کہ مجھے حسد یا جلن ہو کہ اتنی توجہ انہوں نے مجھ پر کبھی صرف نہیں کی۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ وہ کتنے اچھے بیٹے ہیں۔ بڑھاپے میں

انسان کے احساسات بہت نازک ہو جاتے ہیں بالکل بچوں کی طرح اور ماں باپ کا رشتہ تو ہے ہی ایسا کہ ان کے لیے جتنا بھی کرو کم ہے۔ بھگوان کرے ان کی اولاد بھی ان پر جائے اور میرے بچے بھی میرا اسی طرح خیال کریں۔ میرا بھی تو وقت آئے گا ہی اس کی آواز بھیگ گئی اور آنکھیں چھلکنے سی لگیں۔

''بس کرو، مسز چی ورتا...... میں تم سے ملنے آئی تھی تمہارے پتی کے قصیدے سننے نہیں۔'' سفینہ نے وشیالی کو ٹوکا اور وہ ہنس دی بچوں جیسی معصوم ہنسی۔

''بس اب صرف یہی ہنسی رہ گئی ہے جس سے تمہیں پہچانا جا سکتا ہے۔ ورنہ اس ماس کے ڈھیر کے اندر گم شدہ نازک سی ویشالی کا سراغ لگانا اتنا ہی دشوار ہے جتنا سمندر کی تہہ میں موتی تلاش کرنا۔''

ویشالی سفینہ کی سکول کے زمانے کی دوست تھی۔ دونوں ایک ہی کالج میں ساتھ ساتھ پڑھیں۔ سفینہ بھرے بھرے گداز جسم اور متناسب قد و قامت کی گوری چٹی شوخ و شریر لڑکی تھی۔ چہرے کے نقوش اگرچہ موٹے موٹے تھے مگر بڑی بڑی آنکھوں اور گوری رنگت کی وجہ سے کافی خوبصورت لگتی۔ ویشالی تیکھے نقوش اور گہری گہری آنکھوں والی دراز قد نازک اندام لڑکی تھی۔ بہت سیدھی اور معصوم سی سب سے پیاری چیز اس کی ہنسی تھی۔ بچوں جیسی معصوم ہنسی۔ جب وہ ہنستی تو اس کی موتیے کی کلیوں جیسی اجلی رنگت میں گلاب سے کھل جاتے اور اس ہنسی پر کالج کے کئی لڑکوں کا دم نکلتا تھا۔ کالج کے بعد دونوں کی شادیاں ہو گئیں اور جیسا کہ آج کل ایک روش چل پڑی ہے کہ کوئی اپنے وطن میں رہنا ہی نہیں چاہتا۔ سفینہ اپنے شوہر کے ساتھ امریکہ سدھاری اور ویشالی مشرق وسطی۔ دونوں سہیلیاں اپنے اپنے گھر داری کے دھندوں میں ایسی الجھیں کہ باوجود چاہت اور یاد کے ایک دوسرے سے مل نہ پائیں۔ ان کے درمیان فون کے ذریعے رابطہ رہتا تھا گرچہ لمبے لمبے وقفوں کے بعد ہوتا۔

اور اب جو وہ دس برس بعد ملیں تو سفینہ ویشالی کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اگرچہ ویشالی سر سے پیر تک ریشم اور سونے سے لدی ہوئی تھی مگر میک اپ کے باوجود اس کے چہرے پر شادابی نہ تھی سپاٹ سے چہرے اور بیڈھب جسم والی اس خاتون کو دیکھ کر یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ یہی وہ نازک سی لڑکی ہے جس کی بھولی ادائیں اور معصوم ہنسی لوگوں کو دیوانہ بنا دیتی تھی۔

''دیکھو شالو۔ میں نے تو ایک چھوٹا سا سوال پوچھا تھا کہ تو خوش تو ہے نا؟ اور تو نے اپنی پتی کی شان میں عرب شاعروں کی طرح چھ میل لمبا قصیدہ پڑھ دیا۔ ویسے تمہاری باتیں سن کر تو نہیں البتہ تمہیں دیکھ کر مجھے یقین آ گیا ہے کہ جیجا جی واقعی بہت اچھے ہیں۔''

''کیا مطلب ہے؟''

''حلیہ دیکھا ہے اپنا۔ خوشحالی کا یہی مطلب ہے کیا؟ میں تمہارا پتی ہوتی تو تمہیں گھر سے نکال دیتی۔''

اور وہ کھلکھلا کر ہنس دی، وہی معصوم ہنسی۔

''شکر ہے میرا پتی تمہارے جیسا کم ظرف نہیں۔ ظاہر میں کیا رکھا ہے۔ میری پیاری دوست، دل دیکھنا چاہیے۔ میں نے بھی ان کے کردار کا حسن دیکھا ہے۔ ویسے ان کی عالی ظرفی دیکھو کہ انہوں نے کبھی اس بات پر توجہ ہی نہیں کی کہ میں کیا پہنتی ہوں کیا اوڑھتی ہوں...... کیسی لگتی ہوں، کیسی نہیں لگتی۔ یہ سب باتیں تو فروعی حیثیت رکھتی ہیں، بے وقعت ہیں۔ پہننا اوڑھنا تو دنیا دکھاوے کے لیے ہوتا ہے۔ اس کا دل اور روح کی خوشی سے کیا تعلق؟

پتہ نہیں وہ مجھے سمجھا رہی تھی یا خود کو۔ اس نے اپنی سونے کی چوڑیوں سے بھری ہوئی کلائیوں میں کنگن گھماتے ہوئے کہا۔ ''ماتا جی ٹھیک ہی کہتی ہیں ویشالی تمہارا نام تو بھاگیہ شالی ہونا چاہیے کہ تمہیں میرے بیٹے جیسا پتی ملا ہے۔ واقعی یہ بھگوان کی کرپا ہے یا پچھلے جنم کے کرموں کا پھل ورنہ مجھ میں ایسا کون سا گن ہے۔''

اس کی آواز رندھ گئی اور اس نے پوجا کے انداز میں دونوں ہاتھ جوڑ کر آنکھیں بند کر لیں۔ شبنم جیسے دو شفاف موتی اس کے رخساروں پہ ڈھلک آئے۔

اور سفینہ یہ فیصلہ نہ کر پائی کہ یہ خوشی کے آنسو ہیں تشکر کے یا اندرونی کرب کے مظہر۔

بھوت بسیرا

اسے لگا کہ وہ ایک ایسی بستی میں ہے۔ جسے اوندھے منہ الٹ دیا گیا ہے اور جو عرصہ عذاب میں ہے۔ اس کے دل میں شدت سے آسمان کو دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی تاکہ وہ کم از کم یہ تو جان سکے کہ وہ زیرِ زمیں ہے یا زمین کے اوپر۔

اس نے گھڑی پر نگاہ ڈالی...... گھڑی اور کیلنڈر صرف دو ہی چیزیں تھیں جو وقت گزرنے کا پتہ دیتی تھیں ورنہ تو اس اپارٹمنٹ میں وقت جامد معلوم تھا۔ بھاری پردوں اور ایئر کنڈیشنرز کے مدھم شور سے گھر کے اندر ایک مستقل اونگھتی سی فضا طاری رہتی۔

دس بجنے والے تھے تو اس کا مطلب ہے خاصا دن نکل آیا ہوگا۔ ممکن ہے بادل چھائے ہوئے ہوں۔ کیونکہ وہ عفریت جو رات بھر چنگھاڑتے رہے تھے۔ ان کا شور اب بھی کم نہیں ہوا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ٹی۔ وی لاؤنج کی بڑی فرنچ ونڈو کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ وہ گومگو میں تھی کہ پردے ہٹائے یا نہ ہٹائے۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ پردہ ہٹائے گی تو اس چنگھاڑتی ہوا کے ریلے کے بعد فضا میں ایک بہت بڑا جن نمودار ہوگا۔ بچپن میں پڑھی ہوئی قصہ کہانیاں ذہن میں تصویریں بنا رہی تھیں۔ تب پھر وہی چنگھاڑ سنائی دی اور اسے لگا یہ وہی قصے کہانیوں والی بستی ہے۔ جس پر دیو نے قبضہ کر لیا ہے۔ تمام باسی ڈر کر بھاگ گئے ہیں اور اب دیو فتح کے نشے میں مست چنگھاڑتا پھر رہا ہے۔

گھٹن سے گھبرا کر اس نے ہمت کر کے پردہ ہٹا دیا۔ باہر کھلا آسمان اور روشن دھوپ تھی۔

تب پھر وہی چنگھاڑ سنائی دی مگر کوئی جن نمودار نہ ہوا۔ فضا اسی طرح روشن اور صاف رہی۔ کنکریٹ کے اس جنگل میں کوئی پودا کوئی درخت تو تھا نہیں کہ جس سے ہوا کے زور کا پتہ چلتا۔ بس سامنے کی عمارت کی چھت پر لگے انٹینا زورا سے جھولے۔ اس کا ڈر ختم ہو گیا۔

یہ ایک ایسی آبادی تھی جہاں ایک ہی طرز کی بنائی ہوئی سات منزلہ عمارتیں تھیں۔ ہر منزل پر صرف دو فلیٹ تھے جو کافی وسیع و کشادہ تھے۔ لیکن عمارتوں کی ترتیب کچھ ایسی تھی کہ اگر ہوا چلتی تو عمارتوں کے درمیان سے گزرنے کے لیے کچھ ایسی آوازیں پیدا ہوتیں گویا کوئی زبردست طوفان آیا ہوا ہے جبکہ حقیقت میں ایسا نہ ہوتا۔

دن میں جب بچے سکول اور مرد کام پر گئے ہوئے ہوتے تو چپ سادھے یہ سنگدل عمارتیں بھوت بسیرا لگتیں اور اندر بجے سجائے گھر میں اسے یوں لگنے لگتا۔ جیسے وہ بھی کوئی ایسی شہزادی ہے جسے دیو نے محل میں قید کر رکھا ہے۔

اس نے کھڑکی کھولی اور بالکنی میں آ گئی۔ ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ آس پاس کوئی ذی روح نہیں تھا۔ دور عمارتوں کے آخر میں سڑک کا جو چھوٹا سا ٹکڑا دکھائی دے رہا تھا۔ اس پر تھوڑے تھوڑے وقفے سے کوئی گاڑی زن سے گزر جاتی۔ وہ جلدی سے بالکنی سے ہٹ گئی اس لیے کہ یہاں یہ معیوب خیال کیا جاتا تھا اس لیے نہ کوئی پردہ کھلا تھا نہ کھڑکی۔ اس نے کھڑکی تو بند کر دی مگر پردہ کھلا رہنے دیا کہ اسے زندہ روشنی اور کھلا آسمان بہت اچھا لگ رہا تھا۔

جیسے ہی وہ پلٹی چیختی ہوا کے شور کے ساتھ کوئی چیز کھڑکی کے شیشے کے ساتھ ٹکرائی۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ مگر لاؤنج میں پھیلی ہوئی سفید جاگتی روشنی سے اس کی ڈھارس بندھی اور اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک ننھی منی سی چڑیا ریلنگ پر بیٹھی ہانپ رہی تھی۔ وہ ایک بار پھر اڑی اور اپنا ننھا سا جسم شیشے پر دے مارا۔ اس نے آنکھیں میچ لیں۔ ''پاگل'' شفاف شیشے کو کھلا راستہ سمجھ کر دوسری طرف جانا چاہتی ہے۔ یہ چھٹی منزل پر کیا کرنے آئی ہے اور اب کدھر جانا چاہتی ہے۔

وہ اسے دیکھتی رہی۔ اس ننھی خاکی بھوری چڑیا کے زندہ وجود سے کیسا دوسرا ہٹ کا

احساس ہو رہا تھا جب چڑیا اڑ گئی تو اس نے پردے بند کر دیے اور اندر کی اوگھتی فضا میں لوٹ آئی۔

دوسرے روز اس نے پھر پردے کھول دیے اور کھڑکی سے دور ایک صوفے پر بیٹھ کر چڑیا کا انتظار کرنے لگی اور چند لمحوں بعد سچ مچ ہی چڑیا اسی طرح شیشے سے آ ٹکرائی۔ پھر وہ ریلنگ پر جا بیٹھی اور دم لینے کے بعد دوسری بار یہی حرکت دہرائی۔

''پاگل'' اور اس نے پھر آنکھیں میچ لیں۔ ''ہائے کتنی چوٹ لگتی ہوگی اسے''۔ اس نے سوچا اور جب تیسری بار بھی چڑیا نے وہی حرکت دہرائی تو اس نے اٹھ کر کھڑکی کھول دی۔ اس کے کھڑکی کھولنے پر چڑیا اڑ گئی۔

اس نے کھلے آسمان کو دیکھنے کے لیے ابھی بالکنی میں قدم رکھا ہی تھا کہ اس کی نظر سامنے والی بلڈنگ کی بالکنی میں کسی متحرک وجود پر پڑی۔ وہ گھبرا کر پلٹنے ہی والی تھی کہ اس نے دیکھا کہ وہ ایک بڑھیا تھی جس کا سر روئی کے گالے کی طرح سفید تھا۔ اس کا دل طمانیت سے بھر گیا...... ایک زندہ وجود...... اس کی ہم جنس۔ اس نے خوش دلی سے ہاتھ ہلا دیا اور جواباً بڑھیا اندر چلی گئی۔ اسے افسوس ہوا۔ اس نے کھڑکی بند کر کے پردے کھینچ دیے۔ مگر چڑیا اور بڑھیا کے نظارے نے ہی اسے زندگی کی حرارت کا احساس دلا دیا تھا۔

پھر تو اس کا معمول بن گیا۔ وہ جاگ کر دس بجنے کا انتظار کرتی کہ اس چڑیا کو آنا ہوتا۔ خدا جانے پرندوں اور جانوروں میں بغیر گھڑی کے قدرت نے کیسا نظام سیٹ کیا ہے کہ ان میں وقت کا شعور حیرت انگیز حد تک مثالی ہوتا ہے۔ اگرچہ اسے چڑیا کے یوں خود کو تکلیف پہنچانے پر افسوس ہوتا مگر اسے اس کا انتظار بھی ہوتا۔

''انسانی فطرت بھی عجیب ہے کوئی بھی چیز جو اس کے معمولات میں شامل ہو جائے۔ غیر شعوری طور پر اس کی زندگی کا حصہ بن جاتی ہے اور چاہے وہ اس کی پسندیدہ بھی نہ ہو لیکن وہ اس کی عدم موجودگی میں اس کی کمی محسوس کرتا ہے''۔ اس نے سوچا۔

اسے وہ بلی اب تک یاد آتی تھی جو ان کے اپارٹمنٹ کے بیرونی دروازے پر فٹ میٹ پر بیٹھی ہوتی تھی۔ وہ باہر نکلنے کے لیے جیسے ہی تیزی سے دروازہ کھولتی۔ بلی اون کے گولے کی طرح بے آواز لڑھکتی جاتی۔ اس کے منہ سے کراہ سے مشابہ میاؤں نکلتی۔ اسے افسوس بھی ہوتا

اور کوفت بھی اور وہ ملازم کو ڈانٹنے لگتی کہ وہ اسے کہیں پھینک کیوں نہیں آتا۔

وہ چپ رہتا۔

''وہ صرف ہمارے ہی دروازے سے کیوں چپکی رہتی ہے اور بھی تو اتنے گھر ہیں''۔

''دراصل سردی کا موسم ہے نا۔ تو وہ ٹھنڈے فرش کے بجائے فٹ میٹ پر آن بیٹھتی ہے''۔ وہ اپنی صفائی پیش کرتا۔

''کئی بار پھینک آیا ہوں جی۔ پھر لوٹ آتی ہے''۔

ان دنوں سے اسے روزانہ باہر جانا ہوتا تھا کہ اس نے کمپیوٹر کی کلاس لے رکھی تھی۔ وہ ہمیشہ جلدی میں ہوتی۔ جیسے ہی وہ دھڑ سے دروازہ کھولتی بلی اسی کراہ نما میاؤں کے ساتھ لڑھکتی جاتی اور وہ لفٹ میں جاتے جاتے ملازم پر چیختی۔ ''تم اسے کہیں پھینک کیوں نہیں آتے''۔

روز یہی ہوتا۔

ایک دن اسے اتنی جلدی نہیں تھی اس نے دھڑا کے سے دروازہ نہ کھولا۔ بلی حسب عادت اٹھ کر دور چلی گئی۔ وہ لفٹ میں داخل ہوگئی تو بلی دوبارہ میٹ پر آ بیٹھی۔ لفٹ کا دروازہ بند ہونے سے پہلے اس نے دیکھا کہ وہ دروازے کے سامنے پھولدار میٹ پر بیٹھی ہوئی کسی ڈیکوریشن پیس کی طرح خوبصورت لگ رہی تھی۔ تب اس نے سوچا کہ وہ آئندہ دروازہ آہستہ ہی کھولے گی۔ کتنا فرق پڑتا ہے...... ایک دو سیکنڈ کا......

اگلے روز اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا مگر بلی وہاں نہیں تھی۔ مصروفیت کے باوجود اسے کئی بار خیال آیا کہ آج بلی کہاں گئی۔

دوسرے روز بھی بلی نہیں تھی۔

''تم بلی کو کہیں دور پھینک آئے ہو؟'' اس نے ملازم سے پوچھا۔

''دور تو میں کئی بار پھینک آتا تھا۔ مگر وہ لوٹ آتی تھی۔ اس دفعہ میں نے اور ترکیب کی۔ آپ نے شاید دھیان نہیں دیا۔ میں نے دروازے کا میٹ بدل دیا ہے۔ نوکیلا، چبھنے والا، خود ہی چھوڑ گئی۔'' اس نے دادِ طلب نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے دانت نکوسے۔

''تمہیں کس نے کہا تھا میٹ بدلنے کو''۔ اپنا احساسِ جرم اس نے اس پر الٹ دیا۔

''واپس بچھا دو وہی۔ چلو سردی سے بچاؤ کے لیے بیٹھتی ہے تو بیٹھنے دو۔ تمہارا کیا جاتا

ہے۔"

ملازم حیران منہ پھاڑے اسے دیکھتا رہ گیا۔ بڑے لوگوں کی باتیں بھی نرالی ہوتی ہیں مجال ہے کبھی خود پر بات آنے دیں۔

کئی روز تک وہ آہستہ سے دروازہ کھولتی اور لفٹ کا دروازہ بند ہونے تک وہ اس پھولدار میٹ کو دیکھتی رہتی جو اگرچہ دوبارہ بچھا دیا گیا تھا۔ مگر بلی دوبارہ نہ لوٹی۔ مگر وہ اسی طرح کسی خوبصورت ڈیکوریشن پیس کی طرح اس کے ذہن میں ابھرتی۔

اور اب یہ چڑیا اس کے معمولات میں شامل ہوگئی تھی۔

دوسرے روز بھی بڑھیا دکھائی دی اس نے ہاتھ نہ ہلایا مبادا وہ پھر اندر چلی جائے۔ چلو وہ اپنی عمر کی رعایت سے بالکنی میں کھڑے ہوکر کھلے آسمان کے نظارے سے تو لطف لے۔ زندہ جاگتی دھوپ کو تو دیکھے۔ ممکن ہے کوئی پرندہ اس کی بھی تنہائیوں کا ساتھی ہو۔ تو وہ کیوں محروم رہے۔

وہ بالکنی میں نہیں گئی مگر کھڑکی کھول کر کھڑی رہی۔ دونوں کی نظریں ملیں تو بڑھیا نے ہاتھ ہلایا۔ اسے خوشی ہوئی کہ ان کے درمیان رابطہ ہو گیا ہے۔ اس مردہ ماحول میں زندگی شامل ہو گئی اور اسے تنہائی کا احساس نہ رہا۔

رات بہت بے چین گزرتی تھی۔ اس کا شوہر سرکاری دورے پر گیا ہوا تھا۔ وہ وقت گزاری کے لیے پرانے البم کھول کر بیٹھی تھی۔ دفعتاً اوپر کی منزل والے فلیٹ میں عین اس کے اوپر والے کمرے میں ایک دھما چوکڑی سی مچی جیسے کوئی کسی کو پیٹ رہا ہو۔ ساتھ ہی کسی عورت کی دردناک چیخیں سنائی دیں۔ وہ سہم کر سمٹ گئی۔ مگر دوسرے ہی لمحے دفعتاً ٹی۔ وی کی آواز بلند ہوگئی اور وہ دھما چوکڑی دوسرے کمرے میں منتقل ہوگئی۔ مگر وہ خائف سی ہوگئی۔ پتہ نہیں ان بند دروازوں کے پیچھے کیا کیا ہوتا رہتا ہے۔ یہ سر سے پاؤں تک سیاہ عباؤں میں لپٹی ہوئی بد روحوں کی طرح گھومتی ہوئی عورتیں کیا کیا راز اپنے اندر لئے پھرتی ہیں۔

صبح ہوتے ہی اس نے پردہ کھول دیا۔ مگر چڑیا اور بڑھیا اپنے اپنے مخصوص اوقات پر ہی نمودار ہوئیں۔ وہ تو ذرا سی دیر کو کھڑکی میں جا کھڑی ہوتی مگر بڑھیا کافی دیر کھڑی ادھر ادھر دیکھتی رہتی۔ شاید اندر کی گھٹن سے وہ اس سے زیادہ گھبراتی تھی اور پھر اسے کوئی مصروفیت بھی

تو نہیں ہوتی ہوگی۔

کچھ دن گزر گئے۔

اس روز وہ اٹھی اور ابھی وہ پردہ ہٹانے والی تھی کہ اسے بڑھیا کی جھلک دکھائی دی۔ تب ہی بڑھیا کے پیچھے ایک عورت نمودار ہوئی، جھکی اور اگلے ہی لمحے بڑھیا کو جیسے کسی کھلونے کی طرح سر کے بل الٹ دیا۔ وہ دھک سے رہ گئی۔ لپک کر بالکنی میں گئی۔ نیچے جھانکا تو دیکھا چند لوگ بڑھیا کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ وہ عبا پہن، منہ ڈھک کر نیچے اتر گئی۔ مگر اس کے اترنے تک ایمبولینس آ چکی تھی اور بڑھیا کو لے جایا جا رہا تھا۔ وہ واپس پلٹ آئی۔

شام کو اس کی ملنے والی کا فون آیا تو اس نے بتایا کہ تمہارے والے بلڈنگ کمپلیکس میں ایک بڑھیا گر کر مر گئی ہے۔ اس کی بہو اس کی دوست ہے۔ اور پھر باتوں باتوں میں اس نے ساری کہانی کہہ سنائی کہ بیٹا ماں کے نام کی مالا جپتا تھا۔ اس اتراہٹ میں بڑھیا نے اس کی سہیلی بیچاری کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ یوں تو ساس بہو میں بڑی اَن بن رہتی تھی مگر میری دوست بیچاری دل کی بہت اچھی ہے۔ ساس کے مرنے پر یوں تڑپ تڑپ کر روئی ہے کہ کوئی اپنی سگی ماں کو بھی نہ روتا ہوگا۔

بڑھیا کو بالکنی میں کھڑے رہنے کی عادت تھی۔ پتہ نہیں کیسے چکرا کر باہر جا گری۔ اتفاق سے اس وقت گھر میں کوئی نہیں تھی۔ میری دوست قریبی شاپنگ سنٹر سے سودا لینے گئی ہوئی تھی۔ وہ لوٹ رہی تھی کہ ساس کو گرے پایا۔ کیسے کیسے خود کو کوس رہی تھی۔ بین کر رہی تھی کہ ہائے اس بدنصیب کو کیا پتہ تھا کہ یہ برکت اس کے گھر سے اٹھنے والی ہے، تو وہ کاہے کو گھر سے نکلتی۔

بادِ شمال

اس سے متعلق ہر بات ایک خواب ایک گمان سا لگتی ہے۔ جیسے تھی بھی اور نہیں بھی۔ اس سے ملاقات بھی عجیب تھی۔ میں اپنے دفتر میں بیٹھا تھا۔ کام کرتے کرتے جونہی میں نے نظر اٹھائی، کھڑکی کے پردے کی جھلمل سے وہ آتی دکھائی دی۔ خواتین کا میرے دفتر میں آنا کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ میرا کاروبار ہی ایسا ہے۔

میں ایک فیشن ڈیزائنر ہوں۔ اس میں محنت کے علاوہ کوفت بھی بہت ہے کہ آپ اکثر اوقات گاہکوں کو مطمئن ہی نہیں کر پاتے۔ کیسی کیسی پیاری صورتیں آتی ہیں لیکن ان کی کج بحثیاں دوسرے ہی روز ان کی تصویر بدل دیتی ہیں، اس لیے میں اب عورتوں کو دیکھ کر بڑا محتاط کاروباری رویہ اختیار کر لیتا ہوں۔ اس میں شک نہیں کچھ بھولی فاختائیں بھی آتی ہیں۔ تب مجھے اپنا کام بہت پیارا لگنے لگتا ہے۔ بعض تو کام ختم ہونے کے بعد بھی ملنے چلی آتی ہیں۔ یوں کام اور گھر داری کے یکساں معمول میں سے کچھ وقت تازہ دم ہونے کو مل جاتا ہے۔

وہ دفتر میں داخل ہوئی۔ میں حسب عادت کھڑا ہو گیا۔ وہ میری طرف توجہ دیے بغیر بیٹھ گئی۔ چاروں طرف نظر دوڑانے کے بعد اس کی نظر مجھ پر پڑی تو بولی۔ ''ارے آپ بھی بیٹھیے نا۔''

یوں لگتا تھا دفتر اس کا ہے اور میں ملنے آیا ہوں۔ اس کے چہرے پر ایسی ہی لاپروائی، بے فکری اور اطمینان تھا۔ وہ ایک بار پھر دفتر کا جائزہ لینے لگی۔ میں حیران سا بیٹھا اس کی حرکات و سکنات دیکھ رہا تھا۔ چاروں طرف کا بھرپور جائزہ لینے کے بعد وہ بولی۔

''آپ نے اتنی تصویریں کیوں لگا رکھی ہیں؟''

اور میرے جواب دینے سے پہلے ہی بولی۔

''یہ آپ کے ڈیزائن کئے ہوئے ملبوسات ہوں گے۔''

اور ایک بار پھر میرے جواب دینے سے پہلے بولی۔

''ویسے مجھے ان میں ذرہ بھی دلچسپی نہیں۔''

اور پھر اطمینان سے کرسی کی ٹیک لگا کر پہلی بار پوری طرح میری طرف متوجہ ہوئی۔

''میں تو ویسے ہی آپ سے ملنے چلی آئی۔'' اس نے یوں کہا جیسے پرانے جان پہچان والے کہتے ہیں۔ اس لیے مجھے یہ کہنے کی ہمت نہ ہوئی کہ اس کا تعارف کیا ہے۔

''عنایت ہے آپ کی۔'' میں نے از راہ اخلاق انکسار سے کہا۔

''اچھا چلتی ہوں۔'' وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اگر زحمت کی ہی ہے تو چائے تو پی کے جائیں۔''

''پھر کبھی سہی۔'' وہ الوداعی انداز میں ہاتھ اٹھا کر بولی اور مجھے حیران چھوڑ کر چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں کچھ دیر اس کے متعلق سوچتا رہا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھی جو اپنی موجودگی کے احساس سے فضا کو معمور کر دیتے ہیں اور اس میں ان کی ظاہری ہیئت کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ ویسے وہ خاصی خوش شکل تھی اور سلیقے سے پہنے اوڑھے ہوئے تھی۔ پھر کچھ ملاقاتی آ گئے اور بات آئی گئی ہو گئی۔

ایک دن چھوڑ کے وہ پھر آتی دکھائی اور میں پانچوں حواس کے ساتھ چوکنا ہو کر بیٹھا۔ وہ اسی بے تکلفی سے آئی اور بیٹھ گئی۔ اس روز اس نے دفتر اور تصویروں پر کوئی توجہ نہ دی بلکہ میز پر رکھے گلدان میں لگے پھولوں کو چھوا اور جواب طلبی کے انداز میں بولی۔

''آپ نے نقلی پھول کیوں لگا رکھے ہیں؟''

''اس لیے کہ یہ ہر موسم میں موجود رہتے ہیں۔''

''مگر ہر موسم کے اپنے پھول ہوتے ہیں، کوئی بھی موسم پھولوں سے خالی نہیں ہوتا۔'' اس نے پر خیال انداز میں کہا۔

''مگر یہ پھول مرجھاتے نہیں۔''

اس کی آنکھوں میں سوچ کے گہرے بادل اتر آئے۔

''شاید پھولوں کا حسن ان کے مرجھا جانے میں ہی ہے۔'' میں نے اپنی ہی بات کی تردید کی۔

اس کی آنکھوں سے بادل چھٹ گئے اور شفاف جھیلوں جیسی روشنی چمک ابھر آئی۔

''پھول کبھی نہیں مرجھاتے، وہ تو سدا بہار ہوتے ہیں۔ جب آپ پھولوں کو تصور میں لاتے ہیں تو کیا آپ کے ذہن میں ہمیشہ مہکتے، مسکراتے پھول نہیں آتے۔''

''ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔''

میں ابھی اس سے متعارف نہیں تھا۔ نہیں، یہ میں غلط کہہ رہا ہوں۔ متعارف تو میں اس سے ہو چکا تھا۔ صرف نام نہیں جانتا تھا۔ اور میں نے سوچا، میں اس سے نام نہیں پوچھوں گا۔ اس سے فرق ہی کیا پڑتا ہے۔ خود بتا دے تو اور بات ہے۔

''کیا آپ چائے کے لیے صرف پہلی ملاقات میں پوچھتے ہیں؟'' وہ شرارت سے مسکرائی۔

''نہیں، ہر ملاقات پر پوچھتا ہوں، مگر رخصت کے وقت۔'' میں ہنسا۔

''نہیں، نہیں، رہنے دیجئے، میں چلتی ہوں۔ میں آپ کا وقت ضائع کر رہی ہوں۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

میں اس کی گھبراہٹ سے محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔

''آپ چائے پیئے بغیر ہرگز نہیں جاسکتیں۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

وہ کچھ الجھی الجھی سی بیٹھ گئی۔

ایک روز بعد وہ پھر موجود تھی۔ میں کام میں مصروف تھا۔ ایک گاہک کی فرمائش تھی کہ ایک ایسا منفرد ڈیزائن کا لباس ہو جس کی کامدانی کے ہر پھول ہر پتی کی ترکیب میں Love کا لفظ بنے۔ کام دلچسپ بھی تھا اور چیلنجنگ بھی تھا۔ میں پوری توجہ سے کام میں منہمک تھا کہ وہ آ گئی۔ اس وقت اس کا آنا مجھے ذرا کھلا۔ اس وقت کئی آئیڈیاز میرے ذہن میں تھے۔ جن کے نکل جانے کا ڈر تھا۔

"آج تو میں یقیناً آپ کے کام میں حارج ہوئی ہوں۔ لیکن میرے خیال میں کبھی کبھی تھوڑا خودغرض ہو جانے میں کوئی حرج نہیں۔"

میں مسکرا دیا۔ وہ بات بڑی قطعیت سے کرتی تھی اور اکثر اسے اپنے سوالوں کے جواب سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی تھی۔

اس کی نظر میز پر پھیلے ہوئے کاغذ پر پڑی جس پر میں مختلف زاویوں اور لائنوں سے پھولوں اور پتوں سے Love لکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سینکڑوں دیے جل اٹھے اور چہرہ گلابی رنگ میں بھیگ گیا۔

"ایک گاہک کی فرمائش ہے۔"

میں نے فوری وضاحت ضروری سمجھی۔ اگرچہ مجھے ڈر تھا کہ یہ روشنی یہ رنگ بجھ جائیں گے۔ مگر وہاں وہی جگمگ وہی جھلمل تھی۔

"بہت دلچسپ خیال ہے مگر پیار کی تجسیم بہت مشکل ہے اس کے تو ہزاروں رنگ ہیں ہزاروں روپ ہیں، ایک پارچے میں کیسے سمائیں گے۔"

"ہاں، محبت اور موسیقی کی تجسیم ناممکن ہے۔"

"میں نے دیکھی ہے موسیقی کی تجسیم۔" روشنی اور بڑھتی جا رہی تھی رنگ اور شوخ ہوتے جا رہے تھے۔

"موسیقی کی تجسیم؟"

''ہاں، قوسِ قزح کے رنگوں کے سات فوارے تھے جو ابھرتے ڈوبتے سروں کے ساتھ اوپر اٹھتے اور نیچے گرتے تھے۔''

''مگر اس سے موسیقی کی گہرائی تو نہیں دیکھی جا سکتی، یہ تو صرف زیر و بم ہے۔''

اس نے صرف اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ رفتہ رفتہ اس کی آنکھوں اور چہرے کا رنگ معمول پر آنے لگا بلکہ اس کے چہرے کی تازگی اور معصومیت پر سنجیدگی غالب آتی جا رہی تھی۔

اس روز اس کے جانے کے بعد میں دیر تک اس کے متعلق سوچتا رہا۔ میں کوئی ایسا پارسا نہیں کہ لڑکیوں کی صحبت سے لطف اندوز نہ ہوں۔ کبھی کبھی کوئی لطیف جملہ اچھال دینا، کوئی ذو معنی بات کہہ دینا۔ میٹھی نظروں سے دیکھ لینا تو چلتا ہی رہتا ہے مگر اس لڑکی کے لیے میرا دل نہ مانا کہ کوئی ایسی بات کہوں جو میرے دل میں نہ ہو وہ ایسی ہی سیدھی اور سچی لگتی تھی اور میں اسے کسی غلط فہمی میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ اگرچہ اس نے بھی کوئی ایسی بات نہیں کی تھی، مگر اس کا یوں روز روز چلے آنا اور میرے معمولات میں شامل ہو جانا کسی بھی صورت حال پر منتج ہو سکتا تھا۔

اگر اس نے اپنا تعارف نہیں کرایا تو مجھے چاہیے کہ میں اپنا تعارف ضرور کرا دوں۔ ہو سکتا ہے وہ نہ جانتی ہو کہ میں شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ ہوں اور مجھے اپنی بیوی سے بہت محبت ہے۔ یوں ہلکی پھلکی سی بے ضرر خوش وقتی کو میں اپنا حق سمجھتا ہوں۔ مگر یہ لڑکی مختلف تھی۔ ممکن ہے وہ بھی شادی شدہ ہو کہ وہ ایسی بھی کم عمر نہیں۔ مگر خود کفیل لڑکیاں عموماً شادی کا جھنجھٹ پالنے سے گریز کرتی ہیں۔ یہ بھی ذہین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لگتی ہے۔ بہر حال مجھے صورتحال واضح کر دینی چاہیے۔ اپنے حالات کی وہ خود ذمے دار ہے۔ یہ سب باتیں سوچ کر مجھے کچھ اطمینان سا ہوا۔ ورنہ تو ایک بے سکونی سی دل میں گھر کرنے لگی تھی۔

اگلے روز میں نے دفتر میں قدم رکھا ہی تھا کہ وہ آ گئی، مجھے خوشگوار حیرت ہوئی۔ وہ آ کر حسبِ عادت بیٹھی نہیں۔ اس کے ہاتھوں میں خوش رنگ پھولوں کا گلدستہ تھا۔ گلدستہ اس

نے میز پر رکھا اور کارڈ میرے ہاتھ میں تھما کر بولی۔

''میں کافی دیر سے گاڑی میں بیٹھی آپ کا انتظار کر رہی تھی۔ ملے بغیر جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔''

''تو آپ جا رہی ہیں؟''

''ہاں!''

''کہاں؟''

''مسافروں کے ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں۔'' ایک اداس مسکراہٹ اس کے لبوں پر بکھر گئی۔

''چلتی ہوں۔'' اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

میں اس غیر متوقع صورت حال کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ تھا۔ مجھے صدمہ ہوا۔

اس نے ملانے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ چند سیکنڈ تک وہ میرا یا شاید میں اس کا ہاتھ تھامے رہا۔ مجھے ایسا لگا جیسے اس کی آنکھیں جھلملائی ہوں۔ اگلے ہی لمحے وہ خواہ مخواہ ہنسی اور چلی گئی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے اسے چھوڑنے بیرونی دروازے تک گیا مگر اس نے پلٹ کر دیکھا ہی نہیں۔ میرا دل چاہا میں اسے روک کر کہوں۔ ''نام تو بتاتی جاؤ'' مگر زبان نے ساتھ نہ دیا اور میں کچھ اداس سا لوٹ آیا۔

اس کے لائے ہوئے پھول گلدان میں لگاتے ہوئے میں کچھ اور اداس ہو گیا۔ کارڈ کھولا تو دو چھپے ہوئے صحت وخوشی کے دعائیہ فقروں کے علاوہ اس پر کچھ بھی نہیں لکھا ہوا تھا۔ وہ پروائی کے لطیف جھونکے کی طرح آئی اور چلی گئی...... بے نام و بے سمت۔

کوئی ڈیڑھ ہفتے بعد اس کا خط آیا۔ سربستہ راز نے اپنے آپ کو کھول دیا تھا مگر جو کھل کے بھی نہیں کھلا تھا بغیر کسی عنوان بغیر کسی خطاب کے چند جملے، اس نے لکھا تھا۔

''شمال کی طرف کی کھڑکیاں کھلی رکھنا۔ میں ہوا کی صورت تمہارے چاروں طرف پھیل جاؤں گی، تمہیں چھولوں گی، تمہیں محسوس کرلوں گی۔ فاصلے مجھے اپنی یاد تم تک پہنچانے سے

کیسے روک سکتے ہیں۔ تم دو گھنٹیاں بجنے تک فون نہ اٹھایا کرو۔"

پھر روزانہ دن میں کئی بار ایسا ہوتا کہ دو گھنٹیاں بجنے کے بعد فون بند ہو جاتا۔ میں سمجھ جاتا اسی کا فون تھا۔

اگر میں فرصت سے ہوتا تو اس کی اس حرکت پر مسکرا دیتا۔ مصروف ہوتا، گاہک موجود ہوتے یا کبھی ناوقت ایسا ہوتا تو بعض اوقات غصہ آتا اور کوفت ہوتی۔ رفتہ رفتہ اوقات تقریباً مقرر ہو گئے۔ دن میں ایک یا دو بار فون آتا مگر ناغہ کبھی نہیں ہوا تھا۔

یہ معمول برسوں پر محیط رہا۔

ایک روز پورا دن گزر گیا مگر وہ دو گھنٹیوں بعد بند ہو جانے والا فون نہ آیا۔ رات تک چڑچڑے پن نے مجھے آ لیا۔ میں بلا وجہ کئی لوگوں سے الجھ پڑا۔ رات ٹھیک سے نیند بھی نہ آئی۔ دوسری صبح دفتر میں آنے پر فون آیا تو میں انتظار میں تھا کہ اسی کا فون ہوگا۔ مگر جب فون دو گھنٹیوں بعد بند ہو جانے کے بجائے بجتا ہی چلا گیا تو مجھے غصہ آنے لگا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ کیسے کوئی کسی رشتے، کسی تعلق کے بغیر بھی آپ کی زندگی میں شامل ہو سکتا ہے۔

دو تین روز اور اسی طرح گزر گئے اور آج مجھے اس کا خط ملا ہے۔ اتنے برسوں میں یہ اس کا دوسرا خط ہے۔ اسی طرح بغیر کسی تخاطب کے بغیر کسی نام کے، اس نے لکھا ہے۔

"ہر شخص کی زندگی میں کئی لوگ آتے ہیں جو اسے چاہتے ہیں۔ میری زندگی میں بھی ایسے کئی لوگ آئے۔ میری ایک خبطی سی دوست تھی جو کہتی تھی۔ اگر کوئی کسی کو چاہے اور وہ بھی جواباً اسے چاہنے لگے تو یہ ایسا ہی ہے جیسے خود سے محبت کی توثیق کرنا۔ وہ کہتی تھی تم اسے اس لیے چاہتے ہو کہ وہ تمہیں چاہتا ہے۔ اس نے مجھے "نیلی فرٹگ" (Nelle Fertig) کی نظم.............

"I have come to the conclusion"

سنائی تھی، میں بھی قائل ہو گئی۔ وہ نظم تم بھی سنو۔

I have come to the conclusion

She said.

That when we fall in love

We really fall in love with ourselves

That we choose particular people

Because they provide

The particular mirrors

In which we wish to see.

And when did you discover

This surprising bit of knowledge?

He asked.

After I have broken a few

Very fine mirrors

She said.

وہ کہتی تھی۔ ''چاہنا چاہے جانے سے بڑی مسرت ہے، بہت بڑی......خود سے بلند ہو کر اپنی ذات کی نفی کر کے کسی اور کو چاہنا تمہیں کیا سے کیا بنا دیتا ہے۔ شاید میں بتا نہ سکوں۔ الفاظ اس احساس کا احاطہ کرنے سے قاصر ہیں۔ یہ ایک اعزاز ہے جو صرف وسیع الظرف لوگوں کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔''

''اس لیے کہ خود تم نے ایسا کیا ہے۔'' میں کہتی۔

''ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں۔'' وہ مجھ پر ترس کھاتی۔

وقت گزرتا رہا اور مجھے کوئی ایسا نہ ملا جس کے لیے میرے بنجر دل سے محبت کا سوتا پھوٹے اور اس شام مجھے تم دکھائی دے گئے۔ تمہارے ڈیزائن کیے ہوئے ملبوسات کی نمائش تھی۔ لڑکیوں نے تمہیں گھیر رکھا تھا۔ تم مجھے اچھے لگے۔ کیوں اچھے لگے؟ مجھے نہیں معلوم۔

یونہی ہوتا ہے۔ جب کوئی ہمیں اچھا لگتا ہے تو بس لگنے لگتا ہے۔ وجوہات ہم بعد میں تلاش کرتے ہیں۔ دلیلیں تراشتے ہیں۔ دماغ کو سمجھانے کے لیے کہ کوئی ہمیں کیوں اچھا لگا۔

یہ دل بھی عجیب چیز ہے۔ اس کی اپنی ہی دنیا ہے۔ جب ہم اس کے بھید بھاؤ سمجھ نہیں پاتے تو اسے پاگل کہہ دیتے ہیں۔

میں نے بھیڑ میں شامل ہونا پسند نہ کیا اور دوسرے روز تمہیں ملنے چلی آئی اور تب میں نے جان لیا کہ میں نے اس بڑی مسرت کو پالیا ہے۔ چاہنے کی...... خود سے بلند ہونے کی۔

مجھے معلوم ہو چکا تھا تم میری منزل نہیں ہو سکتے، مگر میں تو سفر آغاز کر چکی تھی۔ یہ سفر بجائے خود ایک مسرت ہے، دکھ بھری مسرت۔ جو تمہیں مالا مال کر دیتی ہے...... سوز سے گداز سے۔ کتنی ہی ان دیکھی وسعتیں، انجانی گہرائیاں تمہاری ذات کو لامحدود کر دیتی ہیں۔ پوری دنیا سما جاتی ہے تمہارے اندر۔

میں چلی آئی کہ مجھے جانا ہی تھا۔ تم اپنی چھوٹی سی دنیا میں مگن تھے اور یہ مسرت میرے حصے میں آئی تھی تمہارے نہیں۔ یہ اعزاز مجھے ملا تھا۔ کشورِ دل کا یہ دستور بھی عجیب ہے کہ محبت اپنے محبوب کو حالِ دل ضرور سنانا چاہتا ہے، چاہے اس کا کچھ بھی حاصل نہ ہو۔

میں بھی تمہیں یاد کرتی رہی۔ تمہیں بھی اس سے باخبر رکھا۔ اگرچہ اس سے ہمیشہ ہی میری بے تابیوں میں اضافہ ہوا ہے، میری چھوٹی سی دنیا ہے اور اس کے کچھ مسائل بھی ہیں۔ مگر تمہیں ان سے کیا دلچسپی ہوگی۔ تم نے تو یہ تک نہیں پوچھا تھا میں کون ہوں۔ میں شکایت نہیں کر رہی کیونکہ اس سمندر میں اکیلی میں اتری تھی۔ تمہاری محبت کے موتی کو میں نے اپنے دل کے صدف میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا ہے...... دمِ واپسیں تک۔ کیا پتہ اس کے بعد بھی میں شمال کی ہوا کے ساتھ تمہیں چھونے آؤں۔

تازہ پھول میرے گلدان میں مسکراتے ہوئے کہہ رہے ہیں۔ "ہر موسم کے اپنے پھول ہوتے ہیں، کوئی موسم پھولوں سے خالی نہیں ہوتا۔"

میں نے شمال کے رخ کی کھڑکیاں کھول دی ہیں اور بادِ شمال مجھے چاروں طرف سے

گھیرے سرگوشیوں میں کہہ رہی ہے۔

''محبت کے ہزاروں روپ ہوتے ہیں۔''

''محبت کی تجسیم ناممکن ہے۔'' میں نے کہا تھا۔

''لیکن اب میں نے محبت کی تجسیم دیکھ لی ہے..... تمہاری صورت میں!

پل صراط

سنا تھا شادی کے بعد بیٹے بدل جاتے ہیں نئی دلچسپیوں میں کھو کر..... مگر یہاں معاملہ ہی الٹ تھا، ماں بدل گئی تھی اور وہ بھی اس حد تک کہ کبھی کبھی تو مجھے انہیں پہچاننا مشکل ہو جاتا۔ ایک بیگانہ سی سرد مہری ان کے رویے میں آ گئی تھی یوں جیسے اماں میں سے ماں نکل گئی ہو۔

کبھی کبھی تو مجھے لگتا کہ وہ اپنی حسین و جمیل بہو کی مجھ سے زیادہ عاشق ہیں۔ یوں تو میری بیوی بھی ان سے حسن سلوک سے پیش آتی۔ لیکن اسے اندر ہی اندر وقتاً فوقتاً ان سے کئی چھوٹی چھوٹی شکائتیں رہتیں جن کا وہ اکثر مجھ سے اظہار کرتی اور توقع کرتی کہ میں اس کی حمایت کروں سو مجھے روز ایک نئے امتحان سے گزرنا ہوتا اور میں اس وقت کو پچھتاتا جب میں نے اس کے حسن کے حضور نذرانہ عشق پیش کیا تھا۔

تب تو وہ سب بہت اچھا لگا تھا۔ وہ تڑپ وہ بے قراریاں، وہ چوری چوری چھپکے چھپکے فون، ای میلز، چیٹنگ پر سلام و پیام۔ یہ چھوٹی چھوٹی خوبصورت وارداتیں امنگوں کا ایک جہان آباد کر دیتیں اور دھیمے دھیمے سلگتی آگ ایک دم بھڑک کر جلانے لگتی ایسے میں خود کو اسے سونپنے، تن من نچھاور کرنے کی تڑپ اور بڑھ جاتی اور تب اس کا گریز اس کی بے یقینی جلتی پر تیل کا کام کرتی اور اس دھن میں کوئی وعدہ کوئی قسم ایسی نہ رہتی جو میں اسے یقین دلانے کے لیے نہ کھا بیٹھتا۔

وہ کہتی "ہاں یہ باتیں تب تک ہیں جب تک آپ مجھے پا نہیں لیتے۔"

اور میں صدق دل سے سراپا نیاز ہو کر اسے یقین دلاتا کہ "تمہیں میری محبت کی گہرائی کا اندازہ نہیں۔ میں نے جو کہا ہے اس کے ایک ایک لفظ پر زندگی بھر قائم رہوں گا۔ میری بات کی سچائی کو وقت ثابت کرے گا۔"

اور اب میں وہی بھرنے بھر رہا تھا۔ آخر مرد کو اپنی مردانگی کا بھرم تو رکھنا ہوتا ہے اور وہ اللہ کی بندی بھی مجال ہے کہ طعن وطنز کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے دے۔ میری ذرا سی کوتاہی پر میرے ہی الفاظ اپنی وکالت کے لیے میرے سامنے لا کھڑے کرتی ہے۔ سو میں روز ہی بازیگروں کی طرح تنی ہوئی رسی پر توازن قائم رکھ کر سنبھل سنبھل کر چلنے کی اذیت سے گزرتا ہوں اور اس کی نگران نظریں ہیں کہ مجھے ڈولنے بھی نہیں دیتیں۔ چنانچہ میں سدا کے لیے عرصہ آزمائش میں ہوں اور اس دور نادانی کی قیمت چکا رہا ہوں۔

اب تو میں اسے دور نادانی ہی کہوں گا۔ وہ جسے میں اپنی زندگی کا حاصل وقت سمجھتا تھا۔ میں عشق کو نادانی نہیں کہہ رہا۔ ہاں اس سے عشق کرنے کو نادانی کہہ رہا ہوں جس سے شادی ہونے والی ہو۔ تب تو میں نے سوچا تھا۔ شادی تو ایک معمول کی چیز ہے۔ مزا تو اس وصال سے پہلے کے اشتیاق واضطراب میں ہے۔ نارسائی کی تڑپ میں ہے اور اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کیفیات ہی کچھ الگ تھیں۔ تب یہ کہاں معلوم تھا کہ ہونے والی بیوی سے عشق کر کے میں نے اپنے پاؤں پر جو کلہاڑی ماری ہے اس زخم کی مجھے عمر بھر پرورش کرنا پڑے گی۔

یہ بات میری سمجھ میں بالکل نہیں آتی کہ اچھی خاصی، نازک نفیس اور دلچسپ لڑکی کے اندر سے یہ کیسی عورت نکل آتی ہے جسے بیوی کہتے ہیں۔ جو جیتی ہے نہ جینے دیتی ہے گھنیری پلکوں کی اٹھتی گرتی چلمن کے پیچھے ستاروں بھری آنکھوں، صبیح چہرے پر گلاب کھلاتی شوخ مسکراہٹ اور دلبرانہ لوازں والی پھولوں کی ڈالی جیسی لڑکی محض اپنے مطالبات منوانے اور احکامات پر عمل پیرا کرانے والی ہنٹر والی کیوں بن جاتی ہے۔ یہ سارے ہنر اس نے کس خوبصورتی سے اپنے اندر چھپا رکھے ہوتے ہیں کہ شادی سے پہلے ان کی ہوا تک نہیں لگنے دیتی۔ اور بعد میں تو خیر انسان نہ چاہتے ہوئے بھی اس نادیدہ ہنٹر کے اشاروں پر چلنے لگتا ہے۔

میں خود کو کوستا ہوں کہ کیوں نہ پرانے وقتوں کی طرح والدین کو ان کی پسند کی کوئی ان

دیکھی لڑکی بہو بنا کر لانے دی جو آ کر میرا دل جیتنے کے لیے میرے آگے پیچھے پھرتی، مجھے رجھانے کو جتن کرتی۔ میں آہستہ آہستہ اس پر اپنے لطف و عنایات کے در وا کرتا اور اس کی نیاز مندی کے مزے لوٹتا۔ اور تب میں تنی ہوئی رسی پر چلنے کے بجائے اترا اترا کر چلتا شاید یہ بھی میری خوش گمانی ہو کر اکثر لڑکیاں شوہر گیری کے گر بخوبی جانتی ہیں۔ چلئے یونہی سہی...... مگر تب میرے معصوم ذہن پر مردوں کی دنیا کے بھید کہاں کھلے تھے۔ مجھے یہ کہاں معلوم تھا تضیغی بتاں مجھے یہ موقع زندگی میں پھر بھی مل سکتا ہے...... بلکہ...... بار ہا مل سکتا ہے۔

یہ بھی نہیں کہ اب مجھے بیوی اور اس کے حسن میں کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ بس وہ جو میں ہر وقت مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا اپنی صفائی کے بیان دیتا رہتا ہوں۔ اس سے میں بد مزہ بھی ہوتا ہوں اور کوفت بھی ہوتی ہے۔ مان لیا میں نے کہا تھا۔ ''میری زندگی کی ایک ایک گھڑی اور ایک ایک سانس تمہاری ہے۔ جان، تم اجازت نہ دو تو اب کے یہ دم میرا دم واپسیں سہی۔''

کوئی اس بھلی لوک سے پوچھے (اور بھلا کون پوچھے) کہ ایک چیز محاورہ ہوتی ہے اور جس کے معنی حقیقی نہیں مجازی ہوتے ہیں لیکن اس حسن بے مثال کا حسن صرف خاک کے خول تک محدود ہے۔ اسے زبان و بیان کی لطافتوں، نزاکتوں اور شعر و ادب سے کوئی دلچسپی نہیں۔ کتابوں کی تو وہ ازلی دشمن ہے۔ کتابیں اس کی رقیب ہیں کیونکہ مجھے مطالعے کا بے حد شوق ہے۔ اگر وہ ذرا فیاضی سے کام لیتی اور مجھے تھوڑا سا وقت صرف اپنی ذات کے لیے دے دیتی تو اس کا گھر اور میرا قافیہ یوں تنگ نہ کرتا۔

وہ جو کچھ خوبصورت باتیں اس مختصر دورانیہ عشق میں جذبات نے اس سے کہلوائی تھیں وہ قصہ پارینہ ہوئیں، ہاں میں اس کی یادداشت کی داد دیتا ہوں کہ میرا کہا ہوا کوئی لفظ اسے نہیں بھولا...... وہ اسے میری تعزیر کے لیے فرد جرم کی طرح من و عن دہراتی ہے اور میں بات کا پکا با کردار مرد بننے کی کوشش میں ہلکان ہو جاتا ہوں۔ سو ہوتا وہی ہے جو وہ چاہتی ہے کہ وہ شوہر گیری کے ہنر میں کمال کے درجے کو پہنچی ہوئی ہے۔

یہ میں کیا قصہ لے بیٹھا، بات تو ماں کی ہو رہی تھی۔ ماں کے بدلے ہوئے رویے کو میں نے شادی کے تھوڑے عرصے بعد ہی محسوس کر لیا تھا۔ جس کی کوئی وجہ میری سمجھ میں نہ آتی تھی۔ ٹھیک ہے میں نے اپنی منگیتر سے ڈٹ کر عشق کیا تھا۔ مگر پسند تو انہیں کی تھی رشتہ تو انہوں نے

ڈھونڈا تھا اور وہ خود اسے بڑے چاؤ سے بڑی دھوم دھام سے بیاہ کر لائی تھیں۔

میری عادت تھی کہ میں اپنی ساری الجھنیں ساری پریشانیاں اماں کی گود میں ڈال کر ہلکا پھلکا ہو جاتا۔ اب اگر مجھے بیوی سے کوئی شکایت ہوتی تو میں عادتاً اپنی پرانی پناہ گاہ کی تلاش میں اماں کے پاس جاتا۔ تو وہاں انصاف کی مسند پر بیٹھی اماں ہمیشہ فیصلہ اپنی صنف کے حق میں ہی دیتی۔

''کیوں چھوٹی چھوٹی باتوں پر اسے پریشان کرتے اور خود پریشان ہوتے ہو...... بچی ہے، نادان ہے...... وقت کے ساتھ ساتھ سمجھ جائے گی، تم تو سمجھدار ہو...... صبر سے کام لو۔''

''واہ اماں تیرا انصاف'' میرا جی جل جاتا۔ اور مرے پر سو درے یوں کہ وہ میری بیوی کو بتا دیتیں کہ میں نے اس کی شکایت کی تھی۔ ''پہلوٹھی کا ہے نا اس لیے زیادہ لاڈ پیار کا عادی ہے۔ فی الحال تم زیادہ توجہ دو، زیادہ خیال رکھو، آہستہ آہستہ سمجھ جائے گا، سنبھل جائے گا۔'' وہ اسے سمجھاتیں۔

مگر ماں سے شکایت کرنے کی پاداش میں اس کی ناراضگی دور کرنے اور منانے میں مجھے مزید اپنے گھٹنوں پر آنا پڑتا اور وہ مزید اترا جاتی۔

مجھے دکھ بیوی کے رویے سے زیادہ ماں پر ہوتا۔ تو گویا انہوں نے ممتا کا در مجھ پر بند کر لیا۔ پھر میں نے بھی صبر کر لیا اور ایک اجنبی سی سرد مہری ہمارے درمیان آ گئی۔ یوں باقی سب کچھ حسب سابق چلتا رہا۔ پھر اماں بیمار رہنے لگیں۔ شروع شروع میں تو انہوں نے اسے اپنی بڑھتی ہوئی عمر اور کمزوری پر محمول کیا۔ مگر جب بات ان کی برداشت سے باہر ہو گئی تو ڈاکٹر کو دکھایا گیا۔ ٹیسٹوں اور چیک اپ سے پتہ چلا کہ ان کے گردے کا کینسر سرجری اور علاج کی حد سے گزر چکا ہے اب تو درد کش اور مسکن ادویات کے سہارے وقت کاٹنا تھا اور بس......

ابا تو یوں بولائے بولائے پھرتے کہ انہیں دیکھ کر گھبراہٹ ہونے لگتی۔ یہاں تک کہ بیوی نے بھی کہہ دیا کہ ''ابا جان کو سمجھایئے انہوں نے تو اتنی سراسیمگی پھیلا رکھی ہے کہ ڈر لگنے لگا ہے۔ ہر وقت موت کے فرشتے کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سی سنائی دینے لگی ہے۔''

میں نے ابا کو سمجھایا کہ ''دیکھیں حوصلہ کریں۔ آپ کو اس طرح پریشان اور گھبرایا ہوا دیکھ کر تو وہ ضرور سمجھ جائیں گی کہ انہیں کوئی خطرناک بیماری ہے۔ آپ پڑھے لکھے ہیں خود سوچیں

اگر انہیں اپنے مرض کا علم ہو گیا تو وہ موت کے انتظار میں لمحہ لمحہ مریں گی آپ انہیں یہ اذیت کیوں دینا چاہتے ہیں۔ آپ ان کے پاس زیادہ وقت گزاریں، ان کا خیال رکھیں۔ اچھی اچھی باتوں سے ان کا دل بہلائیں۔ مگر خدا کے لیے خود کو سنبھالیں۔''

یہ سب سن کر ان کے چہرے پر تفکر کے بادل اور بھی گہرے ہو گئے پھر بڑے دیگر لہجے میں بولے۔ بات تو تمہاری درست ہے مگر...... مگر...... خیر چھوڑو شاید تم نہ سمجھ سکو...... ٹھیک ہے بیٹا ٹھیک ہے میں سمجھ گیا۔

مگر وہ سمجھے کچھ بھی نہیں۔ بظاہر بہتر نظر آنے لگے اور غالباً اس دوہری اداکاری نے ان کے دل و دماغ پر زیادہ برا اثر ڈالا متحمل مزاج اور نرم خو ابا ایسے تو کبھی جلد باز نہ تھے کہ یوں اوتالے ہو اماں سے پہلے ہی وہاں ان کے استقبال کو جا پہنچے انہوں نے ٹھیک کہا تھا۔ میں واقعی نہیں سمجھ سکا تھا۔ بڑھاپے میں ساتھی کی جدائی اور آنے والی تنہائی انہیں ڈرا رہی تھی۔ اور وہ اپنا مقدر ماں کو سونپ کر چل دیئے۔ ذیابیطس کے مریض ابا ایک رات سونے میں ہی دل کے خاموش دورے کے ہاتھوں ہمیشہ کی نیند سو گئے۔

اس اچانک سانحے سے سب کو ہی دھچکا لگا۔ اماں نے بڑے وقار سے یہ صدمہ سہا، آخری دیدار کے وقت ان کے الفاظ نے سب کو تڑپا دیا۔ بولیں "پارس کے ابا! تمہیں زیادہ دن تنہا نہیں رہنا پڑے گا بس ہم بھی آنے ہی والے ہیں۔"

ابا کے بعد اماں بالکل ہی ڈھ گئیں۔ اماں کے مزاج کا مجھے علم تھا۔ وہ کسی پر بوجھ بننے والی نہیں تھیں۔ غسلخانے وغیرہ تک تو وہ جیسے تیسے خود جاتیں مگر باقی کاموں میں وہ مدد لینے پر مجبور تھیں۔ ظاہر ہے بیوی پر کافی کام بڑھ گیا تھا۔ اس کے مزاج میں چڑچڑاپن آ گیا۔ میں شام کو آتا تو تھوڑی دیر اماں کے پاس جا بیٹھتا۔ ان کی خیر و عافیت دریافت کرتا۔ بیوی بھی بچے کو ساتھ لے کر وہیں آ بیٹھتی اس نے اپنے کمرے کا چھوٹا ٹی وی بھی ان کے کمرے میں رکھوا دیا تھا تا کہ انکا دل بہلا رہے۔ میں اس کی شخصیت کے اس پہلو سے بڑا متاثر ہوا اور احساس ممنونیت میں باہر آنا جانا کم کر دیا اور کتابیں پڑھنا بھی بند کر دیا۔ گویا اس کی شکایات کا ازالہ کر دیا۔ جس سے مجھے مزید گھٹن کا احساس ہوتا۔

ایک روز میں دفتر سے آیا تو بیوی گھر پر نہیں تھی۔ معلوم ہوا قریبی سٹور سے کچھ ضروری

سامان لینے گئی ہے۔ بیٹے کو ساتھ لے گئی تھی ظاہر ہے اب اماں تو اسے نہیں سنبھال سکتی تھیں۔
میں اماں کے پاس جا بیٹھا۔ میں نے اماں کو دیکھا۔ وہ ہماری نظروں کے سامنے شمع کی طرح پگھلتی جا رہی تھیں۔ ان کی حالت دیکھکر میرے اندر جمی ہوئی برف دھیرے دھیرے پگھلنے لگی۔ وقت جیسے پیچھے کی طرف دوڑنے لگا۔ اپنی چھوٹی سی سلطنت کی مطلق العنان حکمران، تندرست و توانا، چاق و چوبند اماں جن کی زندہ دلی اور خوش مزاجی کی مثال دی جاتی تھی، رونقوں اور ہنگاموں کی جان اور اب یہ کمزور، زرد رو اور بے تاثر، بے حس چہرے والی عورت جیسے کوئی اور ہی ہو اور میرا دل دکھ سے بھر گیا۔

''منے!'' ممتا کے رس میں ڈوبی اس آواز، اس لہجے کو تو میں تقریباً فراموش کر چکا تھا۔ میں سمجھا یہ میرے خیالوں کی بازگشت ہے۔ میں مزید اداس ہو گیا۔

''منے!'' آواز پھر سنائی دی۔ یہ میرا تخیل نہیں حقیقت تھی۔ اماں کی آواز نجانے درد کے کس سمندر کی تہہ سے ابھری تھی کہ میرے دل میں تیر کی طرح اتر گئی۔

''جی اماں'' میں نے تڑپ کر جواب دیا۔

''پاری، ادھر میرے پاس آ کر بیٹھ۔''

میں حیرت زدہ سا اٹھا اور ان کے بستر کے کنارے پر ٹک گیا۔ میں حیران تھا آج اماں میں ماں کہاں سے لوٹ آئی وہ آہستہ آہستہ اٹھ کر بیٹھ گئیں ان کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے اور پھر انہوں نے اپنے استخوانی بازوؤں کے حصار میں لے کر مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔ ان کی کپکپاتی، بھیگی ہوئی آواز نے سرگوشی کی۔ ''کیسی کلیجے میں ٹھنڈ پڑی ہے۔ کتنا زمانہ ہو گیا ہے تجھے پیار کیے، تجھے سینے سے لگائے۔''

میرے دل میں شکووں کے ہجوم نے طوفان برپا کر دیا۔ میں نے کہنا چاہا۔ ''کس نے روکا تھا آپ کو، آپ تو خود ہی بیگانی ہو گئی تھیں۔'' مگر مجھ سے کچھ نہ کہا گیا۔ شاید ان کے سینے سے لگے میرے دل نے براہ راست ان سے یہ سب کہہ دیا تھا کہ وہ بولیں۔

''میں نے تجھے تیری خاطر پیار کرنا چھوڑ دیا تھا۔''

''اب دیکھو اماں کی بہانے بازیاں...... میری خاطر مجھ سے پیار کرنا چھوڑ دیا تھا۔'' اماں کی منطق میری سمجھ میں نہ آئی۔

مگر وہ روتی جا رہی تھیں اور کہتی جا رہی تھیں۔

''بہو کو اللہ سلامت رکھے۔ مجھے جلد ہی اس کی طبیعت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اس کے مزاج میں حاکمیت اور اجارہ داری ہے۔ سو میں نے اقتدار و اختیار کی رسہ کشی کے بجائے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ چلو اچھی نبھ گئی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس گھریلو جنگ میں سب سے زیادہ نقصان تمہیں ہی ہوتا۔ نہ ماں کی بات ٹال سکتے نہ بیوی کی۔ تمہیں دوطرفہ شکوہ و شکایات سننے اور ان کے ازالے کی کوفت اٹھانا پڑتی۔ سو میں نے تم سے دست کش ہو کر تمہیں مکمل طور پر اس کے حوالے کر دیا۔ ہمارا کیا ہے میرے بچے......ہم تو دریا کے کنارے اگے بوسیدہ جھاڑ ہیں۔ جانے کب کوئی لہر آئے اور بہا کر لے جائے۔ تم آپس میں خوش رہو۔ کم از کم میری وجہ سے تو تمہیں کوئی تکلیف نہ ہو۔ تمہیں پریشان دیکھ کر کلیجہ تو میرا ہی کٹتا نا۔''

''یا اللہ، تو نے یہ مائیں کس مٹی سے بنائی ہیں۔'' میرا دل بھی پگھل کر آنکھوں میں آ گیا اور سارے گلے شکوے آنکھوں کے راستے بہہ گئے۔ مجھے روتے دیکھ کر اماں کے آنسو زیادہ تیزی سے بہنے لگے اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔

تب ہی بیوی لوٹ آئی۔ وہ سیدھی ادھر ہی چلی آئی۔ ہم دونوں کو روتا دیکھ کر اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھر آئے اور وہ ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھیلے لیے کچن میں چلی گئی۔

''جاؤ بیٹا، بہو کی مدد کرو۔'' اماں آنسو پونچھ کر بولیں۔

''کوئی بات نہیں اماں۔ کر لے گی خود ہی۔''

''نہیں بیٹا جاؤ'' اماں نے قدرے سختی سے زور دے کر کہا۔ اور خود آہستہ آہستہ لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔

میں نے کچن میں گیا تو بیوی ایکدم پھٹ پڑی۔ ''یہ کونسے ظلم کی یوں رو رو کر فریاد کی جا رہی تھی؟''

میرا دماغ کھول اٹھا مگر ضبط کر گیا کہ جھگڑا بڑھے گا تو اماں کو پریشانی ہوگی۔

کوئی کمی تھی، کوئی شکایت تھی تو مجھ سے کہا ہوتا۔ یوں مظلوم بن کر رو رو کر آپ سے شکایت کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

اس کی آواز تیز اور بلند ہوتی جا رہی تھی۔

''کچھ نہیں کہا انہوں نے، آہستہ بولو وہ سن لیں گی۔ کم از کم انہیں چین سے مرنے تو دو۔'' میں نے جل کر کہا۔

اب تو وہ بھتے سے اکھڑ گئی۔ ''میں چین سے نہیں مرنے دے رہی؟ کبھی سوچا تم نے، سارا دن ایک ٹانگ پر ناچتی ہوں۔ گھر کا کام، بچے کا کام، ان کی غذا دوا ہر چیز کا خیال، کونسی کسر چھوڑی ہے۔ میں نے میری طرف سے وہ ہزار سال جئیں۔ مگر اتنا سمجھ میں آ گیا ہے۔ پرائے کبھی اپنے نہیں ہوتے۔'' اس کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔

میں جانتا ہوں کہ وہ ایک بار بپھر جائے تو اسے سنبھالنا آسان نہیں ہوتا۔

میں گھر سے نکل گیا۔ میرے اندر کی بھڑکتی آگ نے میرے وجود کو دھوئیں سے بھر دیا۔ گھٹن نے سانس لینا دشوار کر دیا۔ سارا منظر دھندلا سا گیا اور اس لمحہ بہ لمحہ گہری ہوتی دھند میں میں نے دیکھا۔ عدالت کا منظر ہے۔ مجرموں کی ایک لمبی قطار بیٹھی ہے۔ کوئی غمزدہ سر بگریبان، کوئی حیران و پریشان، تو کوئی منفعل و سرگرداں، ۔ غرض ہر کوئی اپنی ہی کیفیت میں گرفتار و گم۔

ایک شخص مجرموں کے کٹہرے ہے کھڑا ہے۔ اسے فرد جرم سنائی جا چکی ہے مگر وہ اپنی صفائی میں کچھ بھی نہیں کہہ پا رہا اور...... اور...... کٹہرے میں کھڑا وہ شخص میں ہوں۔ اور ابھی وہ بہت سے میں قطار میں بیٹھے اپنی باری کا انتظار کر رہے ہیں۔ میں چکرا گیا۔ ایک عجیب ناقابل بیان کیفیت نے مجھے خوفزدہ اور مضطرب کر دیا۔ میں بلا ارادہ و بلا مقصد ایک سمت کو چل دیا۔

یہ اچھی بات ہے کہ راستے مانوس قدموں کو پہچان لیتے ہیں اور انہیں بھٹکنے نہیں دیتے۔ اس گمشدگی کی کیفیت کے باوجود میں نے خود کو اپنے گھر کے دروازے پر کھڑا پایا۔ اپنے حواس مجتمع کیے، خود کو سنبھالا اور گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ میں سوچ رہا تھا۔ یہ چند لمحے جو اماں نے اپنی کوکھ سے جنے، اپنے خون سے پروان چڑھائے، اپنے بیٹے کی شادی شدہ زندگی سے چرائے تھے۔ اس کی انہیں معلوم نہیں کیا قیمت چکانی پڑے۔

سونے کے لیے اپنے کمرے میں جانے سے پہلے میں حسب معمول اماں کو نیند کی دوا دینے اور شب بخیر کہنے گیا۔

مگر اب انہیں کسی دوا کی ضرورت نہ تھی۔ وہ اپنے منے، اپنے پیارے کو الوداع کہنے کی طمانیت لیے زندگی کا پل صراط پار کر چکی تھیں۔

پانچ سو کا نوٹ

آج کے دن کو تو مجھے اپنی زندگی کا سب سے خوش قسمت دن سمجھنا چاہیے۔ ابھی مجھے اپنے کام پر آئے ہوئے ایک ہی گھنٹہ گزرا ہے اور میرے پاس پانچ سو گیارہ روپے جمع ہو چکے ہیں۔ اب اگر میں ہفتہ بھر بھی کام پر نہ آؤں تو آرام سے گزر ہو سکتی ہے اور دسمبر کی اس خون جماتی سردی میں ایک ہفتے کی چھٹی سے بڑی عیاشی اور کیا ہو سکتی ہے۔ پُل پر کام کرنے والا انجینئر کہتا ہے۔ ''یار تیرے مزے ہیں کام نہ کاج اور مفت کی کمائی۔ میرا دل چاہتا ہے اُسے کہوں کہ یہ سوٹ بُوٹ، سویٹر، مفلر، ٹوپی پہن کر جو تو سردی کی شکایت کر رہا ہے۔ صرف چند لمحوں کے لیے میری طرح کر کے دیکھ۔ یہ تیر کی طرح ہڈیوں میں اُترتی سرد ہوائیں جن میں تیزی سے گزرتی کاریں اور شدت پیدا کر دیتی ہیں۔ ذرا اسی ویران کو اپنے عُریاں بدن پر سہہ کر دیکھ۔ پھر میں تم سے پوچھوں گا کہ مفت کی کمائی کیسی ہوتی ہے مگر میں صرف ہنس دیتا ہوں۔''

پانچ سو گیارہ روپے میرے ہاتھ میں ہیں کاغذ کے یہ رنگین ٹکڑے جو زندگی قائم رکھنے کا ذریعہ ہیں اور جن کے حصول کے لیے میں اپنے زخموں کی نمائش کرتا ہوں۔ اس وقت مجھے یُوں محسوس ہو رہے ہیں جیسے میں نے مٹھی میں انگارے پکڑ رکھے ہوں اور جن کی تپش میری رُوح تک کو جھلسائے دے رہی ہے میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں خود کو اس زیرِ تعمیر پُل کے

کنارے سے نیچے گرا دوں اور اپنے حقیر وجود سے نجات حاصل کر کے سیدھا خالق کائنات کے پاس جاؤں اور اُس کو جھنجھوڑ کے پوچھوں کہ تجھے اپنی کاریگری کی نمائش کا اور کوئی ذریعہ نہیں سوجھا تھا۔

آج صبح سویرے سڑک کے کنارے میری آنکھوں کے سامنے ایک گاڑی اُلٹی تھی گاڑی میں تین مسافر تھے تینوں ہی مر گئے۔ ڈرائیور کا بازو سیٹ پر پڑا تھا اور جسم باہر سڑک پر اُس کا چہرہ بھی بگڑ گیا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ میں خود ہوں جیسے میرا قد قامت بڑھ گیا ہے۔ ڈرائیور نوجوان تھا میرا دل چاہا کاش وہ میں ہوتا۔ بھرپور زندگی کے کچھ سال گزارنے کے بعد یہ سب ہو جاتا تو کیا غم تھا۔ لیکن اگر خواہشیں اس طرح پوری ہوتیں تو میں خود کو اُس نوجوان کے قالب میں نہ ڈھال لیتا جس کو وہ چینی کی گڑیا جیسی وہ لڑکی پہلی بار اپنے ساتھ لائی تھی۔ اُس لڑکی کو میں کئی برسوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اکثر اپنی سہیلیوں کے ساتھ پکنک پر آتی تھی شوخ و شریر اُس لڑکی کو دیکھ کر میرے دل میں اجنبی اجنبی سے احساس جاگنے لگتے میرا دل چاہتا وہ میری نظروں کے آس پاس رہے اور پھر ایک روز وہ اکیلی ایک نوجوان کے ساتھ آئی اور تب میرا دل چاہا کہ کاش وہ نوجوان میں ہوتا۔ مگر لکھنے والا تو میری تقدیر کے بہت سے باب لکھنا بھول گیا تھا۔

ابھی میں یہ سب سوچ رہا تھا تبھی پُل کے کنارے وہ لمبی چمکیلی کار آ کر رُکی۔ ایک خوب صورت نوجوان جس کا قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا تھا۔ چوڑے شانے بھرا بھرا متناسب جسم اور بے حد جاذب نقوش والا خوب صورت چہرہ۔ اُس کی عمر بیس اکیس برس ہو گی لیکن اُس کے چہرے پر بچپنے کی معصومیت اور ملائمت تھی۔ لگتا تھا اُسے زمانے کے سرد و گرم نے ابھی نہیں چھوا۔ اُس کی گہری گہری خوب صورت آنکھیں ایک معصومانہ حیرت سے آس پاس کے مناظر میں کھوئی ہوئی تھیں وہ شاعر تھا یا مصور کیونکہ وہ سامنے سبز پہاڑوں، نیلے بادلوں اور سنہرے اُجالے کو یُوں دیکھ رہا تھا جیسے دل میں اُن کی تصویر اُتار رہا ہو۔ وہ نظاروں کو دیکھ رہا تھا اور میں اُسے کہ خدا کیسے کیسے شاہکار بنا سکتا ہے۔ یہ سوچتے ہوئے بھی اُس لمحے میرے دل میں اُس رعنا جوان کے لیے تحسین و توصیف تھی اپنا تقابل نہ تھا۔ وہ نوجوان کافی دیر گرد و پیش میں گم رہا اُسے میری موجودگی کا کوئی احساس نہ تھا اور جب وہ اپنی کار کی طرف جانے لگا تو میں نے

اُسے متوجہ کرنے کے لیے اُس کی ٹانگ کو چھوا۔ اُس کی نظر مجھ پر پڑی اُس کی آنکھوں میں خوف و سراسیمگی کی کیفیت اُبھری اور پھر اُسے بڑے زور کی اُبکائی آئی۔ اُس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور دیکھے بغیر ایک نوٹ میری پھیلی ہوئی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ تیزی سے گاڑی نکالی اور ہوا ہو گیا۔ وہ نوٹ پانچ سو روپے کا تھا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ میں خوشی سے دیوانہ ہو جاتا۔ اتنی بڑی خیرات تو مجھے آج تک کسی نے نہیں دی تھی مگر میں تو جیسے پتھر کا ہو گیا۔ نوٹ میری پھیلی ہوئی ہتھیلی پر دھرا رہا اور مجھ میں اپنی جگہ سے ہلنے تک کی سکت نہ رہی۔ اُس کے چہرے کا وہ تاثر میرے ذہن پر اس طرح نقش ہو گیا ہے جیسے کیمرہ عکس کو محفوظ کر لیتا ہے۔ میرا دل چاہا کہ میں سچ مچ ہی پتھر کا ہو جاؤں۔ میرا دل دماغ سب پتھر ہو جائے اور پھر وہ بڑی مشین جو سڑک ہموار کرنے کے لیے چلتی ہے اس پتھر کو کچل ڈالے۔ میں اس سڑک کا حصہ بن جاؤں اور لوگ ہمیشہ کے لیے مجھے روندتے رہیں کہ میرا گھناؤنا وجود ہے ہی اس قابل۔

کچھ لمحوں بعد نوٹ ہوا سے پھڑ پھڑا کر اُڑا اور میری ہتھیلی سے نیچے جا گرا میں نے اُسے اُٹھایا تو جیب میں ڈالنے کی جگہ میرا دل چاہا کہ اسے آگ لگا دوں اور وہ آگ اتنی پھیلے اتنی بھڑکے کہ میں اپنا آپ بھی اُس کے حوالے کر دوں یا پھر اس رنگین کاغذ کے پُرزے کو پُل کے نیچے کھائی میں پھینک دوں اور خود کو بھی تاکہ میں بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جاؤں۔

ویسے تو میں جنم سے ہی ایسا ہوں اور اپنے وجود کا عادی ہو چکا ہوں۔ بس کے ایک حادثے میں میرا باپ چل بسا تھا اور ماں زخمی ہو گئی تھی اُن دنوں ابھی میں اپنی ماں کے پیٹ میں ایک ننھے منے انسانی وجود کی تکمیل کے مراحل طے کر رہا تھا۔ میرے ماں باپ غریب لوگ تھے۔ باپ کی موت کا ماں کو بہت صدمہ تھا۔ وہ جوانی میں ہی اکیلی رہ گئی تھی نہ کوئی آگے تھا نہ پیچھے۔ ویسے بھی بدقسمتی اور غریبی اکیلی ہی ہوتی ہے اُس کا نہ کوئی آگے ہوتا ہے نہ پیچھے۔ سب رشتے ناطے جس مقناطیس کی طرف کھنچتے ہیں وہ تو صرف پیسہ ہے۔

حادثے کی چوٹوں اور پیچیدگیوں اور پھر غم و صدمے کی وجہ سے میری تکمیل نہ ہو سکی اور جب میرا ادھورا وجود اس دُنیا میں آیا تو دائی کی تو چیخ نکل گئی اور میری ماں صدمے سے بیہوش ہو گئی۔ مگر یہ مائیں بھی عجیب ہی چیز ہوتی ہیں اِن کی تخلیق خدا، معلوم نہیں کس مٹی سے کرتا ہے اگر وہ اِس مٹی کا تھوڑا تھوڑا حصہ ہر انسان میں ملا دے تو اس کا کیا بگڑ جائے گا۔ میں ماں کی

واحد اولاد تھا اُس نے مجھے کلیجے سے لگا لیا اور اتنے پیار سے پالا کہ جیسے میں عجیب و غریب چہرے، ایک طرف سے بے بازو کے صرف ٹیڑھے میڑھے کندھے اور دوسری طرف ایک چھوٹے سے بے ہنگم بازو اور ہاتھ والا بونا نہیں بلکہ پریوں کے دیس کا کوئی شہزادہ ہوں۔ مجھے دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں جو دیئے جل اُٹھتے تھے اُنہی کی روشنی تو آج تک میری راہیں منور کئے ہوئے ہے اُس کی نظروں سے جو رس ٹپکتا تھا اُسی کو تو میں زندگی کی تلخی میں گھول کر پیتا رہتا ہوں اُسی کے لہجے کا شہد میں اُن تلخ و ترش لفظوں میں ملا لیتا ہوں جو مجھے اکثر اُن لوگوں سے سننے پڑتے ہیں جن سے میں خیرات مانگتا ہوں۔

میرا ذہن بہت اچھا تھا ماں مجھے پڑھانے کے لیے مدرسے بٹھانے گئی۔ وہاں نیک دل ماسٹر صاحب تو مجھ پر خصوصی توجہ دیتے مگر باقی بچوں کے ہاتھ تو جیسے کھلونا آ گیا وہ مجھے طرح طرح سے ستاتے۔ گھسیٹتے۔ قلمیں چبھوتے کبھی چہرے پر سیاہی سے طرح طرح کے نقش و نگار بنا دیتے۔ کبھی کسی اونچی جگہ پر کھڑا کر کے سب چل دیتے۔ میں سکول سے واپس آتا تو ماں رو رو کر میرا منہ دھلاتی پیار کرتی۔ لیکن یہ سب نہ میں زیادہ عرصہ تک برداشت کر سکا نہ میری ماں اور اُس نے مجھے سکول سے اُٹھا لیا۔ میں پڑھنا سیکھ چکا تھا۔ میں خوبصورت کہانیاں پڑھتا اور خود کو تصور میں جیسا چاہتا بنا کر اُن پرستانوں کی سیر کرتا۔ مجھے اب اس بات کی زیادہ پرواہ نہیں تھی کہ میں بچوں کے ساتھ کھیل نہیں پاتا۔ میں نے اپنی دُنیا الگ بنالی تھی۔

پھر ایک دن ماں نے مجھے کہا کہ بیٹا دیکھ میری زندگی کا بھروسہ نہیں تیرا بھی میری طرح کوئی نہیں میرے چاند۔ میرا تو تیرے سہارے تیری محبت میں وقت کٹ گیا۔ اب تو اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جا۔ میں ماں کی بات سمجھ رہا تھا لیکن سوچ رہا تھا کہ ماں بھی کتنی نادان ہے یُوں کہہ رہی ہے جیسے میں کوئی پڑھا لکھا تندرست نوجوان ہوں جو اپنے پیروں پر کھڑا ہو جاؤں گا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے ماں کی طرف دیکھا تو اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ بولی۔ لکھنے والے نے تیری تقدیر میں جو وسیلہ روزی کا لکھا ہے اس کے سوا تو اور کیا کر سکتا ہے کل میں تجھے کام پر چھوڑ آؤں گی۔

دوسرے دن اُس نے مجھے اچھی طرح سے کھلا پلا کر تیار کیا میری قمیض پھاڑ کر میرا ٹیڑھا میڑھا کندھا عریاں کیا اور جہاں لوگوں کی کافی آمدورفت تھی وہاں فٹ پاتھ پر کھڑا کر

آئی۔ میں تجھے شام کو آ کر لے جاؤں گی۔ پھر وہ مجھے مڑ مڑ کر دیکھتی اور پلو سے آنسو پونچھتی ہوئی چلی گئی اُس کے قدم یُوں اُٹھ رہے تھے جیسے رُوح بدن کو چھوڑ کر جاتی ہے۔

شام کو ماں مجھے لینے آئی تو اُس کے کمزور چہرے پر جھریاں جیسے دُگنی ہو گئی تھیں اور وہ یُوں دکھائی دے رہی تھی جیسے ٹوٹی ہوئی چیزوں کو ایک دوسرے کے اُوپر رکھ دیا جائے تو وہ سالم لگنے لگتی ہیں لیکن ہاتھ لگاتے ہی بکھر جاتی ہیں۔ میں نے ماں کی حالت دیکھ کر اپنی خستگی اور دل شکستگی چھپالی اور ماں سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگا۔ ماں نے مجھ سے آج دن بھر کی رُوداد نہ پوچھی کوئی سوال نہ کیا۔ کوٹھڑی میں پہنچ کر کھانا دانا کھانے کے بعد میں نے ماں سے کہا۔ ''دیکھو ماں اب تیرا پوت کماؤ ہو گیا ہے۔ یہ لے میری پہلی کمائی اور میں نے پیسے ماں کے قدموں میں رکھ دیے اور ماں گھٹنوں پر سر رکھ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ میں ماں کو تسلیاں دینے لگا کہ تُو خود ہی تو کہتی ہے کہ لکھنے والے نے میرے لئے روزی کا یہی وسیلہ لکھا ہے تو تیرا میرا کیا اختیار''۔ اور میری صابر و شاکر ماں بین کر کے رونے لگی کہ لکھنے والے نے یہ سب میرے ہی نصیب میں کیوں لکھا ہے۔ بس کر ماں۔ بس کر۔ تو اپنے نصیب کو کیوں روتی ہے۔ رونا ہے تو میرے نصیب کو رو۔ لوگ اپنے عیبوں کو چھپاتے ہیں۔ ان کو سنوارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں نے تو سُنا ہے لوگ اپنے چہرے اور جسم اپنی پسند کے بنوا لیتے ہیں اور میں اپنے عیبوں کی نمائش کرتا ہوں۔ اپنے زخموں کو بیچتا ہوں۔

''بس کر۔ اوئے بس کر۔ میرا دل پھٹ جائے گا'' اُس نے مجھے لپٹا لیا اور ہم دونوں رونے لگے۔

''کیوں اتنی گوڑھی گوڑھی باتیں کرتا ہے کیوں اتنا سوچتا ہے۔ یہ کتابوں نے تجھے ایسا بنا دیا ہے تو اندر ہی اندر پتہ نہیں کیا کیا سوچتا رہتا ہے۔ مجھے پتہ ہوتا تو تجھے وہ چار لفظ بھی نہ پڑھاتی''

''یہی تو تُو نے اچھا کام کیا ہے تجھے کیا پتہ ماں۔ وہ دُنیا کیسی ہے اُسی دُنیا میں ہی تو میں جی رہا ہوں اُدھر کوئی مجھے نہیں ٹھکراتا کوئی نفرت نہیں کرتا۔''

ماں مجھے کام سے لگا کر ایسا سوئی کہ پھر نہ اُٹھی۔ پتہ نہیں سچ مچ ہی اُس کا دل نہ پھٹ گیا ہو۔ رفتہ رفتہ میں اپنے کام میں پکا ہو گیا۔ میں اُن جگہوں کا انتخاب کرتا جہاں امیر لوگوں کی

آمد و رفت ہو۔ پٹرول پمپ تفریح گاہیں اور پل وغیرہ۔

میری زندگی میں ایسے ہزاروں مواقع آئے جب مجھے دھتکارا گیا نفرت سے دیکھا گیا میں ان رویوں کا تقریباً عادی ہو گیا ہوں مگر آج اُس خوبصورت نوجوان نے نہ مجھے دھتکارانہ نفرت سے دیکھا اُس کا ردِعمل غیر اختیاری تھا۔ وہ پہلے خوفزدہ ہوا اور پھر اُسے ایسے اُبکائی آئی جیسے کسی نے بہت غلیظ گندگی کو دیکھ کر آتی ہے وہ شاید اپنے اِس ردِعمل سے شرمندہ بھی تھا کہ اُس نے گھبرا کر پانچ سو کا نوٹ ہی دے ڈالا۔

مجھے لگ رہا ہے میں کسی لق و دق صحرا میں تن تنہا کھڑا ہوں اور پھر جیسے ریت اُڑاتی ہوا کے بہاؤ میں میرے قدم بے اختیار ایک سمت اُٹھنے لگے۔

اپنی واحد پناہ گاہ ماں کی قبر سے لپٹے ہوئے میرا دل چاہ رہا ہے کہ میرا ریزہ ریزہ وجود بھی میرے آنسوؤں کے ساتھ اِس کے اندر جذب ہو جائے۔

اپنے ادھورے وجود کی مکمل بدصورتی کا جس شدت سے مجھے آج احساس ہوا ہے اِس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

رحلت

''یاران امیر لوگوں کی بھی سمجھ نہیں آتی، مجھے لگتا ہے یہ اپنے اختیار میں کسی کو شریک نہیں کر سکتے۔ اسی دل افروز خان ہی کو دیکھ لو، یہ لق و دق گھر اور تنہا۔''

''ارے واہ، تم اس گھر کو لق و دق کہہ رہے ہو...... پھولوں، پودوں، پیڑوں سے لے کر گھاس تک ہر چیز مرتب و مزین، روشنیوں کی ترتیب دیکھو، آرائشی اشیاء کا انتخاب دیکھو۔ کون بدذوق اس کے ذوق کی داد نہیں دے گا۔ ایسا آراستہ و پیراستہ گویا شاہی محل۔''

نبیل کے لہجے میں رشک و حسد کی آمیزش تھی۔

''ہاں شاہی محل، مگر بددعایا ہوا، آراستہ و پیراستہ مگر سنسان۔''

''سنسان کیسے؟ نوکروں کی پوری فوج رہتی ہے۔''

''حد کرتے ہو یار، کیسی باتیں کر رہے ہو۔ نوکر احکام تو بجا لا سکتے ہیں۔ ساتھی یا شریک تو نہیں ہو سکتے۔ بیوی بچوں کا بدل تو نہیں ہو سکتے۔ مجھے معلوم ہے اکثر لوگوں کو اس کے رہن سہن، اس کے طور اطوار پر رشک آتا ہے۔ لوگ اس کی دوستی آشنائی پر فخر کرتے ہیں اور جو دوست یا شناسا نہیں ہیں وہ کسی نہ کسی حیلے سے اس کے حلقہ احباب میں داخل ہونا چاہتے ہیں، مگر یقین کرو مجھے اس پر ترس آتا ہے، صرف ترس...... بہت اکیلا لگتا ہے وہ مجھے۔ اور وہ غالباً اسی اندر کی تنہائی سے گھبرا کر محفلیں بپا کرتا رہتا ہے۔ مگر مانگے کی رونق سے بھی کبھی تنہائیاں

دور ہوئی ہیں۔"

امجد کی یہ بات نبیل کے دل کو لگی۔

"ہاں یار، یہ تو سچ کہا تم نے۔ ماتھے کی رونق سے بھی کبھی تنہائیاں دور ہوئی ہیں۔" اور ایک لمبی سرد آہ بھری۔

نبیل کی بیوی شادی کے آٹھ سال بعد ایک روز دو بچوں سمیت اسے چھوڑ کر ایسے لاپتہ ہوئی کہ پھر لاکھ کوشش کے باوجود اس کا سراغ نہ ملا۔ وہ صرف ایک لائن کا نوٹ چھوڑ گئی تھی کہ

"بچے اپنی ماں کے پاس ہیں ان کی فکر نہ کرنا اور اپنی نئی زندگی شروع کر لینا۔"

اس کی اس سفاکانہ بیوفائی پر ذلت، رسوائی اور دکھوں کے جس جہنم سے اسے گزرنا پڑا یہ تو کچھ وہی جانتا تھا، وقت کے ساتھ ساتھ وہ سنبھل تو گیا مگر عورت ذات سے اس کا اعتبار ایسا اٹھا کہ اس نے دوبارہ شادی نہ کی۔

امجد پشیمان سا ہو گیا۔ اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ اس نے انجانے میں اپنے دوست کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔

دل افروز سات برس قبل اس شہر کے کاروباری افق پر نمودار ہوا تھا۔ دولت کی فراوانی تھی۔ مہینوں میں گھر، دفتر سب کچھ تیار ہو گیا۔ اس نے شہر کے سب سے بڑے ہوٹل میں اپنی تعارفی پارٹی کی اور دیکھتے ہی دیکھتے کاروباری دنیا میں اپنا ایک مقام بنا لیا۔ امجد بھی ایک چھوٹا کاروباری تھا اور دل افروز کی کامیابی کا ایک راز یہ بھی تھا کہ وہ چھوٹے بڑے کسی کو بھی نظر انداز نہیں کرتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ بڑی مشینوں کو چلانے کے لیے چھوٹے پرزے بھی اہم اور ضروری ہوتے ہیں۔ اس کا براہ راست بھی کئی بار سابقہ پڑ چکا تھا۔ دل افروز اپنے ہی مزاج کا آدمی تھا۔ اس کی سوچ کا ایک مخصوص انداز تھا، جو شخص اس کے بنائے ہوئے سانچے میں ڈھل جاتا تھا۔ اس کے ساتھ اس کا اچھا تعلق بن جاتا۔ دل افروز کا سانچہ چونکہ سیم و زر سے بنا ہوا تھا اس لیے لوگ بخوشی پگھل پگھل کر اس میں ڈھلنے لگے۔ لیکن اس سے قطع نظر اس میں بہت سی خوبیاں بھی تھیں۔ وہ مہمان نواز اور فیاض تھا۔ اس میں کاروباری دیانتداری تھی۔ وہ لین دین کا کھرا اور وعدے کا پکا تھا۔ اس کی متنوع شخصیت سے ہر ایک کی اپنی اپنی الگ دلچسپی اور تعلق تھا۔ مگر امجد کو تجسس تھا کہ اس کی ذاتی زندگی اتنی ویران اور تنہا کیوں ہے؟ کسی

ناکام عشق کی دل شکستگی؟ کوئی سفاک بیوفائی یا کچھ اور......؟

اور قدرت نے اس کے تجسس کی تسکین کا ایسا انتظام فراہم کیا جو اس کے سان وگمان میں بھی نہیں تھا۔

وہ کچھ روز کے لیے اپنے کاروباری دورے پر شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ واپسی کے سفر میں ساتھ کی نشست پر بیٹھے ہم سفر سے گفتگو پر کھلا کہ وہ دل افروز کو ملنے جا رہا ہے۔

عماد خوش طبع اور بذلہ سنج شخص تھا۔ منٹوں میں بے تکلف ہو گیا۔ کہنے لگا، تھے تو ہم دونوں ہم جماعت، ڈگری بھی ایک سی لی مگر وہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا اور ہم ابھی تک وہیں کھڑے ہیں۔ شروع ہی سے دیوانہ تھا۔ جنون تھا اسے کام کرنے کا۔ کہتا تھا، میں کام کی خاطر کام کرتا ہوں، دولت کمانے کے لیے نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اگر مجھے کام سے عشق ہے تو دولت کو محنت سے۔ مگر اس میں یہ بڑی بات ہے کہ وہ اپنے دوستوں سے اسی طرح ربط اور محبت رکھتا ہے۔ اب یہی دیکھو کہاں وہ کہاں میں۔ خود ہی فون کر کے بلایا کہ "یار رسمی ملاقاتوں اور پارٹیوں سے اکتا گیا ہوں تم آؤ تو خود سے بھی ملاقات ہو جائے۔"

اندھے کو کیا چاہیے دو آنکھیں۔ فوراً بھاگا چلا آیا کہ چلو بیٹا کچھ دن عیش بھی کر لو اور اس سالے کولہو کے بیل کو بھی ذرا تازہ دم کر آؤ۔ دونوں نے فون نمبروں کا تبادلہ کیا اور اپنی اپنی منزل کو روانہ ہو گئے۔

اور آج صبح عماد نے اسے شام کے کھانے کے لیے مدعو کیا تو اس نے یہ کہہ دیا کہ وہ تو خود مہمان ہے۔ اسے بلانے کے بجائے بہتر ہے کہ وہ اس کے پاس آ جائے۔ تب پاس بیٹھے دل افروز نے اس سے فون لے کر خود کہہ دیا۔ "آپ سے کس نے کہہ دیا کہ وہ مہمان ہے۔ یہ اس کا اپنا گھر ہے اور جس میں وہ جسے چاہے بلا سکتا ہے۔ آپ بلا تکلف چلے آئیں۔ اسے پھر کسی روز بلا لیجیے گا۔"

اور آج شام صرف وہ تینوں تھے۔ آج کا دل افروز ہمیشہ سے کتنا مختلف لگ رہا تھا۔ عماد پرانی بے تکلفی کے ناطے تو تکار سے بات کر رہا تھا اور وہ بھی ترکی بہ ترکی جواب دے رہا تھا۔

اس بے تکلف فضا میں امجد کا تجسس سوال بن کر اس کے لبوں تک آ ہی گیا۔

''آپ کو خدا نے بے حد و حساب نوازا ہے۔ پھر آپ نے اپنے لیے تنہا زندگی کیوں چنی؟''

''یہ میرا انتخاب نہیں امجد صاحب، میری تقدیر ہے۔'' دل افروز سنجیدہ ہو گیا۔

وہ بھی خاموش ہو گیا۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے ایسا سوال کر کے ہنسی مسکراتی فضا کو مکدر کر دیا۔

''نہیں بھئی، ایسا کچھ نہیں۔ ہمارے گروپ میں تو سب سے پہلے اسی نے شادی کی تھی۔ امتحانوں کے فوراً بعد نتیجے کا بھی انتظار نہ کیا۔ مہ رو بھابی تھیں بھی مہرو، بڑی ملنسار، زندہ دل اور ہنس مکھ۔''

اللہ نے دو پیارے پیارے بچے وقاص اور زہرہ بھی دیئے۔ بچے ولایت پڑھنے گئے تھے۔ وہیں اپنی پسند کی شادیاں کیں اور ادھر ہی بس گئے۔ یہ جا کر سال میں ایک دو بار مل آتا ہے۔

مہ رو بھابی سدا کی جلد باز، سب کو چھوڑ کر سب سے پہلے عدم کی راہ لی، اس کے بعد اس کا دل اس گھر اس شہر سے اچاٹ ہو گیا اور یہ سب چھوڑ چھاڑ، بیچ باچ یہاں چلا آیا۔

اس دوران دل افروز کسی سوچ میں گم سامنے پڑے گلدان میں لگے پھولوں کی پتیاں توڑ توڑ کر بکھیرتا رہا۔

''آپ نے عقد ثانی کے بارے میں سوچا؟'' امجد نے براہ راست دل افروز سے پوچھا۔

''ارے ہم تو منتیں کر کر کے ہار گئے مگر یہاں وہی مرغ کی ایک ہی ٹانگ ہے۔''

عماد کی بات پر دل افروز دھیرے سے مسکرایا۔

''عقد ثانی'' اس نے دہرایا۔

''اب میرے پاس اتنا وقت کہاں؟'' وہ پر خیال انداز میں بولا۔

''یعنی؟'' عماد نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا۔

''ہاں، میں نے پوری زندگی جس کے ساتھ گزاری اسی کو نہیں سمجھ پایا تو اب میرے پاس وقت ہی کتنا ہے کسی اور کو سمجھنے کا۔''

''گزر جائے گا اسی کام کاج کے دھیان میں لگ کر۔''

اب امجد سے زیادہ عماد تصویرِ حیرت بنا ہوا تھا۔ ''مگر تم لوگوں کی تو بڑی خوش باش زندگی تھی۔''

''ہاں ہماری ٹھیک ٹھاک خوش باش زندگی ہی تھی۔'' دل افروز نے کہا۔ وہ بے چین سا لگ رہا تھا۔

''تو پھر ایسی الجھی الجھی باتیں کیوں کر رہے ہو، ضرور اندر کی بات کچھ اور ہے۔'' عماد نے کہا۔

لگتا تھا وہ بھی بھرا بیٹھا تھا اور اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا تھا۔ بولا۔ ''ٹھیک ہے میں بھی جو بوجھ روح پر اٹھائے پھرتا ہوں اسے ہلکا کرنا چاہتا ہوں، مگر مجھے نہ درمیان میں ٹوکنا اور نہ کوئی سوال کرنا۔''

''ٹھیک ہے۔'' عماد آہستہ سے بولا۔

''تم تو جانتے ہو میں شروع سے محنت کا عادی ہوں۔ میری لگن اور استقلال نے ترقی کے دروازے کھول دیئے۔ اثر و رسوخ اور وسائل و ذرائع بڑھے تو روپے پیسے کی فراوانی ہو گئی اور دولت وہ مقناطیس ہے جس کی طرف ہر آسائش خود بخود کھنچی چلی آتی ہے۔ میں نے مہ رو اور بچوں کو ہر سہولت اور آسائش مہیا کی۔

وہ طبعاً لاپرواہ تھی اور میں گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ چلنے والا آدمی، سو بعض اوقات تلخی ترشی ہو جاتی۔ مہ رو نے کبھی میرے غصے کا برا مانا نہ جواباً کبھی لڑی بھڑی۔ پہلے تو مجھے اس کی یہ عادت بہت اچھی اور مصالحت آمیز لگی کہ ایک تو بات بڑھتی نہیں تھی فوراً ختم ہو جاتی تھی دوسرے میری مردانگی کی تسکین ہوتی تھی کہ میرے سامنے کسی کو لب کشائی کی جرأت نہیں۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ رفتہ رفتہ اس کی یہی عادت مجھے کھلنے لگی۔

مجھے لگتا کہ میں بول بک کر چپ ہو جاتا ہوں اور وہ دیوار بنی رہتی ہے۔ اسے میرے غصے کی نہ کوئی پرواہ ہوتی ہے اور نہ کوئی اثر لیتی ہے۔ اور چپ تو وہ اس لیے رہتی ہے کہ اس کا قصور ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی میرے دل میں یہ بات راسخ ہوتی گئی کہ میری بات ہمیشہ صحیح اور ناقابلِ تردید ہوتی ہے۔

اس وقتی سردی گرمی کے علاوہ زندگی اچھی خاصی گزر رہی تھی۔ بچے بڑے ہو گئے تھے۔ بیٹا اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرون ملک چلا گیا تھا۔ بیٹی بھی گریجویشن کے بعد نئے آفاق کی پرواز کو پر تول رہی تھی۔

میری عادت ہے کہ اگر میں کسی بات سے منع کر دوں اور وہ پھر بھی کی جائے چاہے اس کی کوئی بھی وجہ ہو تو مجھے بے طرح غصہ آتا ہے۔ مہ رو کو میری اس عادت کا علم تھا سو وہ ایسا کوئی موقع نہ آنے دیتی۔ لیکن اس روز نجانے کیوں ایسی ہی کوئی بات ہو گئی۔ مجھے اس پر شدید غصہ آیا۔"

"اور غصے میں انسان، انسان کہاں رہتا ہے۔" امجد کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"سچ کہا آپ نے۔ میرے جو منہ میں آیا بک دیا۔"

وہ میرے عین مقابل کے صوفے پر بیٹھی تھی۔ وہ اسی طرح سکون سے بیٹھی مجھے یوں دیکھتی رہی جیسے سکرین پر کوئی فلم دیکھ رہی ہو۔ ہلنا جلنا اور اپنی جگہ سے اٹھنا تو در کنار اس کے چہرے کے تاثرات تک میں خفیف سے بھی تبدیلی نہ ہوئی۔ میرا دماغ کھولنے لگا۔ میں اٹھا، پاؤں پٹختا، آس پاس کی چیزوں کو ٹھوکریں مارتا خوابگاہ میں چلا آیا۔ چند لمحوں بعد مہ رو بھی آرام سے چلتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ اس کی یہ ادا مجھے مزید دیوانہ کئے دے رہی تھی۔

"اب تک تو میں صرف وارننگ دیتا رہا ہوں لیکن آج میں جو کہوں گا وہ کر کے دکھاؤں گا۔ اس گھر میں یا میں رہوں گا یا تم۔ بلکہ میں ابھی اسی وقت تم سب کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے چلا جاؤں گا۔" میری نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ایک لمحے کو مجھے لگا اس کی آنکھوں میں کوئی تاثر جاگا۔ لیکن یہ غالباً میرا وہم تھا کیونکہ دوسرے ہی لمحے اس کی دھیمی پر سکون آواز ابھری۔ "نہیں، آپ کیوں جاتے ہیں میں چلی جاتی ہوں۔"

یہ الفاظ اس نے ایسے عام سے لہجے میں کہے جیسے کسی کی دستک پر دروازہ کھولنے کے لیے وہ کہہ دے۔ "آپ کیوں جاتے ہیں، میں چلی جاتی ہوں۔"

"جانے کس مٹی کی بنی ہوئی ہے۔" میں حیران تھا۔

اب میرا غصہ نقطۂ عروج پر پہنچ چکا تھا۔ "ہاں، ہاں، نکل جاؤ میرے گھر سے ابھی، اسی وقت۔" میں چلایا۔

"اچھا!" اس نے الماری کھولتے ہوئے کہا۔

پھر الماری میں سے ہینگر پر لٹکے ہوئے کپڑے اتارے اور غسل خانے میں بدلنے چلی گئی۔ کپڑے بدل کر اس نے پرس اٹھایا اور اسے کھول کر چیزیں چیک کیں اور جوتے پہننے لگی۔ لیکن مجال ہے جو اس کے سکون میں فرق آیا ہو۔ اس دوران میں بھی اپنی عینک، گھڑی، بٹوہ اور دوسری ضروری چیزیں سنبھال چکا تھا۔ میں کمرے سے نکلنے لگا تو اس نے پوچھا۔

"آپ کہاں جارہے ہیں؟"

"مجھے کسی کو بتانے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

اور میں کمرے سے باہر آ گیا وہ بھی پیچھے پیچھے باہر آ گئی۔

اتنے میں اوپر اپنے کمرے سے کالج جانے کے لیے تیار ہو کر نیچے اترتی میری بیٹی نے مجھے دیکھ کر کہا۔

"مجھے کالج چھوڑ دیں بابا، ڈرائیور آج چھٹی پر ہے۔" وہ اس سارے ہنگامے سے بے خبر تھی۔

"اچھا بیٹا!" میں نے کہا۔

"واپسی میں لینا بھی ہوگا بابا!" اس نے لاڈ سے کہا۔

"لے لوں گا بیٹے۔" میں نے بھی پیار سے جواب دیا۔

اس نے پرس رکھ دیا۔ اب وہ قدرے الجھی الجھی دکھائی دی۔

میں اسے الجھے دیکھ کر قدرے مطمئن ہوا۔

میرا غصہ تو اتر چکا تھا مگر اس کا میرے غصے کا اثر نہ لینے کا غصہ ابھی باقی تھا۔ میں نے بیٹی کو کالج سے تو لے لیا مگر ڈراپ کر کے باہر ہی سے چلا گیا۔ میں اسے سبق دینا چاہتا تھا۔ شام کو ہم لوگوں نے ایک قریبی عزیز کی شادی میں جانا تھا۔ بیٹی نے فون کر کے گھر آنے کو کہا، تو میں نے کہا۔

''میں مصروف ہوں ادھر سے ہی پہنچ جاؤں گا۔ تمہیں آفس کا ڈرائیور بھیج دیتا ہوں تم اس کے ساتھ آ جانا۔''

شام کو حسب معمول پہنے اوڑھے، بنی ٹھنی بیٹی کے ساتھ تقریب میں پہنچ گئی مگر اس کے باوجود وہ بہت اداس اور پریشان لگ رہی تھی۔ مجھے مزید اطمینان ہوا۔

''اب پتہ چلا، میرے لفظوں میں تو جیسے معنی ہی نہیں رہے تھے۔ ذرا تھوڑا اور پتہ چل لے اسے۔'' میں نے سوچا۔

میں نے بیٹی سے کہا کہ مجھے ایک ضروری کام سے شہر سے باہر جانا پڑ رہا ہے۔ مجھے آج رات ہی نکلنا ہوگا۔ وہ گھر جا کر میری پیکنگ کر دے۔ میں ابھی آ کر سامان لے لوں گا۔

وہاں فنکشن میں نہ میں نے اس سے کوئی بات کی اور نہ اس نے کوئی بات کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ وہ پرسکون نظر آنے کی پوری کوشش کر رہی تھی مگر پریشانی اس کے چہرے سے مترشح تھی۔

میں سامان لینے گھر آیا تو بیٹی نے پوچھا۔ ''بابا! آپ امی سے ناراض ہیں؟''

''نہیں بیٹے! ناراضگی کی کیا بات ہے، آپ اپنی امی کے ساتھ رہیں، میری کیا ضرورت ہے؟'' میں نے کہا۔

مہ رو کے چہرے پر ایک ناگواری کیفیت آئی اور وہ اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔

بیٹی رونے لگی اور جانے سے روکنے پر اصرار کرنے لگی۔ اس کی پریشانی دیکھ کر میں نے اس سے وعدہ کر لیا کہ میں دو روز میں لوٹ آؤں گا مگر وہ ذرا اپنی ماں کو سمجھائے۔

ان دو دنوں کے دوران بیٹی تو بار بار واپسی کی تاکید کے لیے فون کرتی رہی مگر اس نے کوئی فون نہ کیا۔ اور جب میں لوٹا تو سب کچھ یوں حسب معمول تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

ہاں، اس واقعے کے بعد اس میں ایک خوشگوار تبدیلی آئی۔ مہ رو گھر کے کاموں میں بہت دلچسپی لینے لگی۔ ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مصروف نظر آتی۔ مجھ پر بھی بھرپور توجہ دینے لگی۔ میرا ہر چھوٹا بڑا کام خود اپنے ہاتھ سے کرتی، یعنی سب کچھ ویسا ہو گیا تھا جیسا کہ میں ہمیشہ سے چاہتا تھا مگر جس میں کسی نہ کسی وجہ سے کوئی نہ کوئی کسر رہ جاتی تھی۔

زندگی کے وہ چار سال جیسے مثالی تھے۔ میں حیران تھا کہ اگر وہ یہ سب کچھ اتنی خوبی سے کر سکتی تھی تو پہلے کیوں نہ کیا۔

حد تو یہ ہے کہ گزشتہ برسوں میں اس نے جو وزن بڑھا لیا تھا اور جسے کم کرنے کی تحریک کے لیے، نصیحت، طعن وطنز، غصہ ناراضگی، پیار دلار کوئی بھی حربہ کارگر نہ ہوا تھا۔ وہ بھی اس نے رفتہ رفتہ اس حد تک کم کر لیا کہ دور سے نوعمر لڑکی لگنے لگی۔ اس کا رنگ روپ البتہ مدھم پڑ گیا تھا اور وہ کچھ زیادہ ذمہ دار اور سنجیدہ نظر آنے لگی تھی۔ پہلے کی طرح باتونی اور پرسوز نہیں رہی تھی۔ خیر یہ عمر کا تقاضا بھی ہو سکتا ہے۔ میں نے سوچا تھا۔

اور ایک روز وہ کھڑے کھڑے بیہوش ہو گئی۔ ایمرجنسی میں ہسپتال لے گئے۔ وہاں ٹیسٹ ہوئے تو میں چکرا گیا۔ معلوم ہوا اسے اینوریکسیا (Anorexia) ہے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ کوئی بھی آرگن صحیح طور پر کام نہیں کر رہا۔

ڈاکٹر حیران تھے کہ اتنے پڑھے لکھے لوگ اتنی جاہلانہ حرکت کیسے کر سکتے ہیں کہ مرض کو اس حد تک بڑھنے دیں اور انہیں مزید حیرت اس پر تھی کہ مجھے یعنی شوہر کو علم تک نہیں۔

میں سخت شرمندہ تھا اور میرے پاس واقعی کوئی جواب نہ تھا۔ مگر اس نے کبھی کوئی شکایت کی ہی نہیں تھی۔ میں اس کی قوت ارادی پر حیران تھا۔

بیٹی نے رو رو کر برا حال کر لیا۔ بیٹے کو اطلاع دی گئی تو وہ تڑپ اٹھا اور علاج کے لیے ماں کو وہاں اپنے پاس لے جانے کے انتظامات کرنے لگا کہ وہاں علاج دوا کی بہتر اور جدید سہولتیں میسر تھیں۔ اگرچہ ڈاکٹر زیادہ پرامید نہیں تھے مگر ہم کوئی دقیقہ فروگزاشت کرنے کو تیار نہ تھے۔

"نہ کرو یہ سب، اب کچھ نہیں ہوگا۔ میرے جانے کا وقت آ گیا ہے۔" مہرو نے آہستہ سے کہا۔

میں نے اس سے شکوہ کیا۔ "مہرو تم نے یہ کیا کیا؟ ایسا کرتے ہوئے تمہیں ہم میں سے کسی کا خیال نہیں آیا؟"

وہ خاموش رہی۔

"نہیں مہرو...... تم ہمیں یوں چھوڑ کر نہیں جا سکتیں۔"

اس کے ہونٹوں پر ایک نحیف سی مسکراہٹ ابھری۔

''چلی تو میں اسی روز گئی تھی جس روز تم نے کہا تھا۔ یہ تو میں تمہاری زندگی جی رہی تھی......صرف تمہاری۔''

دل افروز خاموش ہو گیا۔

اور وہاں ایسا سناٹا چھا گیا جیسے وہاں کوئی ذی روح موجود نہ ہو اور فضا تک نے سانس روک لی ہو۔

کوئے ملامت

اور وہ پھر کوئے ملامت میں تھا۔ وہ چھ سو میل دور سے یہاں تک تو چلا آیا تھا۔ مگر یہاں پہنچ کر اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ وہ چند ثانیے ساکت کھڑا بند دروازے کو دیکھتا رہا۔ پھر خود کو مجتمع کر کے گھنٹی کے بٹن پر انگلی رکھ دی۔ دروازہ فوری طور پر اور اتنی تیزی سے کھلا کہ وہ گڑبڑا گیا۔ دروازہ خود شائستہ بھابی نے کھولا تھا۔ غالباً وہ اس وقت دروازے کے کہیں آس پاس ہی تھیں۔ اسے دیکھ کر اس کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ چند لمحوں تک وہ کھڑے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ شائستہ کی نگاہوں میں کوفت تھی اور اظہر کی آنکھوں میں التجا...... اظہر نے اس کی نگاہوں کی سختی سے گھبرا کر نظریں جھکا لیں...... اور شائستہ نے کچھ سوچ کر دروازے سے ہٹ کر اسے راستہ دیتے ہوئے کہا۔ ''آ جاؤ''

وہ مجرموں کی طرح سر جھکائے اندر داخل ہوا اور اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا لاؤنج میں پہنچ گیا۔

''بیٹھو'' اس نے کہا اور خود اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''میں دراصل یہ البم دینے آیا تھا۔ پرانے سامان میں سے نکلی ہے۔'' اس نے اپنے آنے کا جواز بتایا۔

''تم کب تک ایسے بہانے تلاش کرتے رہو گے۔ پرانے سامان میں سے تو کچھ نہ کچھ

نکلتا ہی رہے گا۔" اب شائستہ کی آواز میں دکھ اور تاسف تھا۔

"ہاں ٹھیک کہہ رہی ہو تم۔ پرانے سامان میں سے تو کچھ نہ کچھ نکلتا ہی رہے گا۔" اور اس کے لہجے میں بے پناہ اداسی اتر آئی۔ جسے محسوس کر کے شائستہ نے مزید کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

"چائے پیو گے؟" اس نے اپنے ملائم فطری لہجے میں اپنائیت سے کہا۔

"پلا دو" وہ بھی ذرا سہولت پذیر ہو گیا۔

"تم بیٹھو بھابی، چائے میں بنا لاتی ہوں۔" عقب سے شاداب کی آواز آئی۔

دونوں نے بیک وقت مڑ کر دیکھا مگر وہ کچن میں داخل ہو چکی تھی۔

"کیسے ہو تم؟" شائستہ نے پوچھا۔

"کیسا ہوں؟ معلوم تو ہے تمہیں"

"ہاں اور بچے؟"

"ٹھیک ہیں"۔

اور وہ دونوں پھر چپ تھے۔

اظہر سوچ رہا تھا کہ یہ اچانک لفظوں کا قحط کیوں پڑ گیا ہے؟ ادھر گھر میں بھی یہی عالم تھا۔ لگتا ہے اس کے ہنستے بستے گھر کے باسی اچانک بھوتوں میں بدل گئے ہیں۔ سائے چلتے پھرتے رہتے۔ اس کے دونوں بیٹے عدیل، فضیل اور وہ خود ایک کمرے میں بھی آ بیٹھتے، شام کے کھانے پر بھی عموماً اکٹھے ہوتے۔ مگر ہر کوئی اپنی اپنی سوچوں، اپنے اپنے خیالوں میں گم...... ضرورتاً کوئی بات کرنی بھی ہوتی تو بس چند لفظوں کا تبادلہ ہوتا۔ بعض اوقات تو ایک دوسرے کے سوال کا جواب صرف چہرے کے تاثرات یا آنکھوں کے زاویے ہی سے دے دیا جاتا......

معلوم نہیں وہ ایک دوسرے سے خائف تھے یا اپنے آپ سے......

اور پھر ملائم پیروں کی مدھم چاپ اسے اپنی سوچوں کی دنیا سے باہر لے آئی۔ یہ آہٹ جو اس کی سماعتوں میں گھلی ہوئی تھی اور جسے وہ ہزاروں آوازوں کے بیچ میں بھی پہچان سکتا تھا...... یہ مدھم چاپ...... یہ نرم آہٹ صبح کی پہلی آواز تھی جو وہ بند آنکھوں سے سنتا تھا، جس سے اس کے دن کا آغاز ہوتا تھا...... ایک عمر گزری تھی اس کی اس آواز کے ساتھ...... دونوں کی نظریں ملیں ایک قندیل سی دونوں کی نگاہوں میں جگمگائی مگر فوراً ہی بجھ گئی۔ اس نے ٹرے تھامتے ہوئے شاداب کا ہاتھ ذرا سا

لرزا، اظہر کا ہاتھ بھی کپ تھامتے ہوئے کپکپا رہا تھا۔ شائستہ الجھی الجھی نظروں سے دونوں کو دیکھتی رہی پھر اٹھ کر چلی گئی۔

اور الجھنوں نے تو جیسے اس گھر کا راستہ ہی دیکھ لیا تھا۔

جیسے ہی عدیل گھر میں داخل ہوا، کچن سے بابا نے اسے پکارا۔

''یہ بابا پھر کچن میں کیا کر رہے ہیں؟'' عدیل نے الجھتے ہوئے سوچا۔

وہ ان کے پاس کچن میں چلا گیا۔ بابا پیشہ وروں جیسی مہارت اور تیزی سے سینڈوچ پلاسٹک کے مہر بند لفافوں میں ڈال کر انہیں کاغذ کے خاکی لفافوں میں ڈال رہے تھے۔ پھر انہوں نے مارکر سے ان دونوں بھائیوں کے نام لکھے کیونکہ انہوں نے دونوں کی پسند کے الگ الگ سینڈوچ بنائے تھے۔ وہ انہیں فریج میں رکھتے ہوئے بولے۔ ''کل کا ناشتہ'' پھر وہ اسی تیزی سے کمرے میں گئے اور کسی سلیقہ مند عورت کی طرح ہینگروں میں لٹکے ان دونوں کے استری شدہ کپڑے لاؤنج والے سٹینڈ پر لٹکاتے ہوئے کہا۔ ''کل کے کپڑے''۔

پھر گھڑی دیکھتے ہوئے بولے۔ ''مجھے ایئرپورٹ چھوڑ دو۔''

''اچھا'' کہہ کر عدیل نے باپ کے ہاتھ سے بیگ پکڑا اور باہر گاڑی میں جا بیٹھا۔ راستہ خاموشی سے کٹا۔ بابا نے نہیں بتایا تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ اس نے بھی نہیں پوچھا کیونکہ اسے معلوم تھا وہ کہاں جا رہے ہیں۔ ایئرپورٹ پر اتر کر بابا نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ ان کے ہاتھ کی گرفت وہ ساری بات کہہ گئی جو ان کے دل میں تھی۔ اس کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ بابا نے اس کی پیشانی چومی اور بھیگی آنکھیں لئے مڑ گئے۔ وہ تھوڑی دیر کھڑا ان کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا اور ڈبڈبائی آنکھیں لئے واپسی کے لیے پلٹ گیا۔

وہ گھر پہنچا تو گیٹ کھلا ہوا تھا۔ کرمو دروازے پر ہی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ کار پورچ میں کھڑی کر کے اندر گیا۔ اندر فضیل لاؤنج کے عین وسط میں کھڑا کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ عدیل نے اسے سلام کیا تو وہ منہ سے تو کچھ نہ بولا۔ صرف سر کے اشارے سے اسے جواب دیا اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

''بابا کو ایئرپورٹ چھوڑ کر آ رہا ہوں۔ کہہ رہے تھے کل واپس آ جائیں گے۔ وہ لنچ بنا کر رکھ گئے ہیں اور کپڑے بھی تیار کر گئے ہیں۔''

فضیل کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاغذات کو زور سے

صوفے پر پٹخا اور جیسے ہوا میں ٹھوکریں مارتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس کا ذہن طرح طرح کے خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ ''بابا آخر چاہتے کیا ہیں؟ اماں کے ہوتے ہوئے بھی کرموہی سارا گھر سنبھالتا تھا اور سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہی چل رہا تھا۔ تو اب بھلا بابا کو کیا ضرورت ہے کہ وہ کچن میں گھسے کھانا بنا رہے ہیں کپڑے استری کر رہے ہیں۔ آخر وہ ثابت کیا کرنا چاہتے ہیں؟ غالباً وہ ماں بھی بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر جتنی جتنی وہ خاطرداریاں کرتے ہیں اتنی ہی، مجھے چڑ ہوتی ہے۔ وہ یہ سب کب تک کریں گے۔ کیا وہ اس گھر کا بکھرا ہوا شیرازہ سمیٹ سکیں گے' کھیل سمجھا تھا انہوں نے اس سارے معاملے کو...... اور یہ تو انہوں نے سوچا ہی نہیں کہ اماں اور ان کے علاوہ اس گھر میں دو اور افراد بھی ہیں جو ان کے فیصلے سے متاثر ہو سکتے ہیں اور جن کی صرف مالی کفالت سے ان کی ذمہ داری پوری نہیں ہو جاتی۔

ٹھیک ہے، اماں کے ساتھ زیادتی ہوئی۔ بابا کا قصہ شروع ہوتے ہی انہوں نے کسی امکانی خطرے کے پیش نظر حفظ ماتقدم کے طور پر ملازمت اختیار کر لی تھی گو کہ بابا حسب معمول اخراجات اٹھاتے رہے...... بہت مشکل تھا وہ وقت...... ذہنی انتشار کا وہ وقت...... تب اماں نے کتنے صبر اور حوصلے سے ہمیں اور گھر کو سنبھالے اور جوڑے رکھا...... لیکن جب بابا لوٹ آئے تو وہ انہیں معاف نہ کر سکیں اور ایک دم ہی بکھر گئیں۔ وہ گھر میں بھی چنداں دلچسپی نہ لیتیں وہ تو یہ بھی بھول بیٹھی تھیں کہ وہ ماں بھی ہیں...... انہیں اپنی انا بہت پیاری تھی نا...... وہ تو اپنی ذات میں اتنی الجھ گئی تھیں کہ سب سے لاتعلق ہو گئی تھیں...... ہونہہ'' اور اس بھوت بسیرے میں اس کا دم الجھنے لگا۔ وہ پھر سے باہر جانے کے ارادے سے کمرے سے نکل کر لاؤنج میں سے گزرا تو عدیل پوچھ بیٹھا۔

''کہاں جا رہے ہو بھائی۔''

''جہنم میں'' جواب ملا۔

اور عدیل کو لگا ماں کے ساتھ ساتھ اس کا بھائی بھی کھو گیا ہے اور وہ بالکل تنہا رہ گیا ہے۔

ادھر شائستہ تھوڑی دیر بعد لوٹی تو وہ دونوں بیٹھے پرانی تصویریں دیکھ رہے تھے...... پرانی یادیں دہرا رہے تھے۔ مسکرا رہے تھے، ہنس رہے تھے، کھلکھلا رہے تھے، شائستہ کا دل بری طرح دکھ گیا...... کاش...... وہ اسی طرح ہنستے مسکراتے ساتھ ساتھ رہ سکتے......

اس کی آمد پر دونوں جھجک کر خاموش ہو گئے، شاداب اٹھ کھڑی ہوئی تو اظہر نے البم

اسے تھما دی۔ وہ جھلملاتی آنکھیں لیے اپنے کمرے میں چلی گئی اور اظہر اتنا اداس، اتنا لٹا پٹا لگ رہا تھا جیسے ساری یادیں اسے تھما کر خالی ہاتھ رہ گیا ہو۔

یہ دیکھ کر شائستہ اسے جو بات کہنے کے ارادے سے آئی تھی۔ فوری طور پر نہ کہہ سکی اور چائے کے خالی برتن اٹھا کر چپ چاپ لوٹ گئی۔

ادھر شاداب اپنے کمرے میں سوچ کی پہنائیوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ گزرے ہوئے لمحوں کی یادیں کاغذی نقوش کی صورت اس کی گود میں پڑی تھیں۔ یادوں کا ایک پر شور سمندر تھا جو اس کے ذہن کو تہہ و بالا کئے دے رہا تھا۔ اچھلتی، امڈتی لہریں آتیں، اسے بھگوتیں اور اضطراب بن کر اس کے وجود میں اتر جاتیں۔ وہ سوچ رہی تھی غلطی، اگرچہ سراسر اظہر کی تھی، اس نے علی الاعلان ایک دوسری عورت سے معاشقہ کر کے اور پھر برسرِ عام شادی کا اعلان کر کے اسے سب کی اور خود اپنی نظروں میں ذلیل کر دیا تھا اور جب وہ سال ڈیڑھ سال بھٹکنے اور وہاں سے ٹھکرائے جانے کے بعد لوٹ آیا تو وہ کیسے ایک دم بڑھ کر اسے گلے لگا لیتی۔ آخر زخموں کو مندمل ہونے میں وقت تو لگتا ہے۔

یہ بھی سچ ہے کہ اگرچہ اس نے ملازمت تو اظہر کے بدلے ہوئے رویے کی وجہ سے حفظ ماتقدم کے طور پر کی تھی۔ مگر وہاں سکول میں اسے بہت پسندیدگی اور اہمیت ملی تو اسے بھی کچھ اپنی شخصیت کا احساس ہوا۔ وہ چاہتی تھی کہ اظہر کم از کم اپنی غلطی کا احساس کرے چہ جائیکہ اس سے ناز برداریوں کی توقع رکھے۔ لیکن اگر اسے معلوم ہوتا کہ اس کے نتائج اتنے سنگین ہوں گے۔ تو وہ یہ زہر بھی پی لیتی۔ اسے تو خود بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ اسکے اندر کتنا گہرا اترا ہوا ہے۔ اس کی زندگی کا ایک بڑا حصہ ہے اس کے پاس...... پھر بچے اور ان کی جدائی...... کیسے وہ سب شاخ سے ٹوٹے پتوں کی طرح بکھر گئے تھے...... کاش وہ حالات کی نزاکت کو سمجھ لیتی...... کاش...... اور آنسوؤں کی برسات اس کے چہرے کو ہی نہیں، روح کو بھی بھگو رہی تھی۔

ادھر اظہر بھی ماضی کی وادیوں میں بھٹک رہا تھا۔ تین بہنوں کا اکلوتا لاڈلا بھائی اور والدین کی آنکھ کا تارا ہونے کے ناطے اس کی ہر شرارت سے صرفِ نظر کیا جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے بھی خوب خوب نوازا تھا۔ بھوری آنکھیں، بھورے بال، اجلی رنگت، موزوں ناک نقشہ، نکلتا ہوا قد، حاضر دماغ، حاضر جواب، گلا بھی خوب پایا تھا۔ ہر جگہ مرکزِ توجہ بن جاتا۔ لڑکیاں پروانہ وار اس کے گرد گھومتیں۔ خوب نوک جھونک چلتی، گپ شپ ہوتی۔ مگر بات اس سے زیادہ بھی

نہ بڑھی کہ گھر کا ماحول اور تربیت ہی ایسی تھی۔ تعلیم مکمل ہوئی، ملازمت ہوئی اور اماں نے اس کے لیے چاند سی دلہن ڈھونڈ نکالی۔ شاداب اس کی زندگی میں بہار بن کر آ گئی۔ اللہ نے دو صحت مند اور خوبصورت بیٹوں سے بھی نوازا۔ گویا زندگی ہر طرح سے مکمل اور پرسکون تھی۔ بچے اچھی تعلیم حاصل کر رہے تھے اور اب تو ماشاءاللہ جوان ہو گئے تھے۔

اور تب پتہ نہیں کیسے وہ شوخ وشنگ شائلہ کی اداؤں کے جال میں الجھ گیا۔ شاید اسے یہ احساس اچھا لگا کہ جوان بچوں کا باپ ہوتے ہوئے وہ اب بھی اتنا پرکشش ہے کہ کوئی طرحدار حسینہ اس کے عشق میں گرفتار ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے اس کی وجہ مڈل ایج کرائسس رہی ہو (Middle age crisis)۔ جب ایک سی ہموار زندگی گزارتے ہوئے انسان اکتانے لگتا ہے۔ ایسے میں یہ ہلچل اس کی ہنگامہ خیز، چلبلی طبیعت کو بھا گئی ہو۔ وجہ کچھ بھی رہی ہو وہ تب ضرور ہوش وخرد کا دامن چھوڑ بیٹھا تھا۔ ہواؤں میں اڑنے لگا تھا۔ اور وہ جو نوجوانی میں بھی کسی لڑکی کے لیے سنجیدہ نہیں ہوا تھا۔ گھر پھونکنے کو تیار ہو گیا تھا۔

اسے شاداب کے احساسات کی پرواہ تھی۔ نہ بچوں کے جذبات کی اور نہ ہی سوسائٹی میں اپنی نیک نامی کی کوئی فکر...... بات بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ شادی کے عہد وپیماں بھی ہو گئے۔ مگر وہ کھلاڑی نکلی...... اسے شادی کے لیے اس سے بہتر بدل مل گیا تو اس نے شادی شدہ، جوان بچوں کے باپ کو بڑی سہولت سے جھٹک دیا۔ تب اس کے ہوش ٹھکانے آئے۔ ٹوٹا پھوٹا پھر سے اپنے آشیانے کو لوٹ آیا۔ سدا کا لاڈلا نازبرداریوں کا عادی امید کر رہا تھا کہ بیوی اس کی واپسی پر شکرانے کے نفل پڑھے گی۔ بچھ بچھ جائے گی تاکہ وہ صرف اسی کا ہو کر رہے پھر ہاتھ سے نہ نکل جائے لیکن یہاں بیوی بڑی لیے دیے رہی۔ کچھ خود بھی چوٹ کھائے جذباتی صدمہ اٹھائے ہوئے تھے۔ اوپر سے گھر والوں نے احساس دلایا کہ اس نے کوئی زیادتی نہیں کی۔ بیوی کو کوئی تنگی نہیں دی۔ اس کی کمائی پر کبھی نظر نہیں رکھی۔ پوری پوری مالی کفالت کی، ہر طرح کی آزادی دی اور آخر کوئی تو کمی اسے محسوس ہوئی ہوگی جو وہ گھر سے باہر دلچسپی لینے پر مجبور ہوا۔

پھر تو یہ صرف یہ کہ اس کے دل میں کوئی احساس جرم نہ رہا بلکہ اسے شاداب میں کئی خامیاں نظر آنے لگیں۔ تب خفیہ میٹنگز میں اسے یقین دلایا گیا کہ اسے ایسی سینکڑوں اور مل سکتی ہیں۔ یہ بہت اترانے لگی ہے۔ چھوڑو اسے اور پھر شاداب کی عدم دلچسپی اور عدم توجہی مزید منفی سوچ کا سبب بنی اور ایسے ہی کسی کمزور لمحے میں جب وہ اپنے بھائی کی علالت کے سبب

دوسرے شہر گئی ہوئی تھی، اس نے وہیں شاداب کو طلاق نامہ بھجوا دیا...... چھبیس سالہ رفاقت لمحوں میں ٹوٹ گئی...... اور ایسا کر گزرنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ وہ اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کر چکا ہے اور جس کی تلافی کی بھی اس نے کوئی صورت نہیں چھوڑی تھی۔

اسے ایک دم احساس ہوا کہ اسے تو شاداب سے شدید محبت ہے۔ جس کا اسے اس سے پہلے کبھی اس طرح احساس نہیں ہوا تھا۔ ہاں! اسے کوئی بھی عورت مل سکتی ہے...... مگر گزشتہ چھبیس سال کی خوشیاں اور غم...... وہ تو صرف شاداب کے اور اس کے سانجھے تھے...... یہ خلا کوئی اور عورت کیسے پر کر سکتی ہے...... وہ عدیل، فضیل سے ماں کی طرح محبت کیسے کر سکتی ہے...... اس نے اپنے ساتھ ساتھ اپنے بچوں پر بھی ظلم کیا ہے۔ کیسا اچھا لگتا ہے شاداب سے ملنا، بات کرنا۔ یوں جیسے آدمی اپنے اندر لوٹ آئے۔ مکمل ہو جائے اور آخر وہ ساعت بے مہر آ پہنچی جب یہ لمحاتی خوشی، یہ عارضی سکون بھی اس سے چھننے والا تھا۔ شائستہ لاؤنج میں لوٹ آئی اس کے چہرے پر پتھریلی سنجیدگی تھی۔ اس نے اظہر کو مخاطب کیا۔

''سنو اظہر! میں نے ہمیشہ تمہیں بھائیوں کی طرح سمجھا اور بے شک تم نے بھی بھائیوں جیسا ہی سلوک رکھا۔ اسی مروت نے میری زبان بند رکھی۔ ادھر شاداب کی بھی میں بھابی ہی نہیں دوست بھی ہوں اور اب اس کے والدین کے انتقال کے بعد اس کی ماں بھی ہوں اور یہی گھر اس کا میکہ ہے۔ مگر آج میں وہ تلخ سچ کہنے پر مجبور ہو گئی ہوں۔ جو اٹل حقیقت ہے اور جس سے تم آنکھ نہیں چرا سکتے۔'' اس کے لہجے میں خود بخود تلخی گھل گئی۔

تم نے...... اظہر تم نے...... بے سوچے سمجھے جو منحوس پروانہ بھیجا تھا۔ وہ کاغذ نہیں سد سکندری تھی جو اب تم دونوں کے درمیان حائل ہے۔ اب تم دونوں اسے اپنی زبانوں سے چاٹنا چھوڑ دو...... تم اسے کبھی عبور نہیں کر پاؤ گے...... تمہاری اور شاداب کی یہ آخری ملاقات ہے۔ کیونکہ اس طرح ملنے جلنے کی اجازت نہ شریعت دیتی ہے، نہ معاشرہ اور نہ ہم......''

اور وہ دونوں یوں ساکت تھے جیسے ان کی روحیں ان کے جسم چھوڑ چکی ہوں۔

پھر اظہر شکستہ لہجے میں آہستہ سے بولا۔ ''میں سمجھ گیا شائستہ...... میں تمہارا مشکور ہوں کہ تم نے مجھے اتنی بار ملنے دیا اب تمہیں کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ میں پھر کبھی نہیں آؤں گا۔ میں ابھی واپس چلا جاؤں گا جو بھی فلائٹ ملی۔ اظہر اپنا بیگ اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایک ایسی حسرت بھری نظر شاداب پر ڈالی کہ شائستہ کا دل رو اٹھا شاداب نے ملتجی نظروں سے بھابی کو

دیکھا۔ شائستہ اس کی نظروں کے سوال کو سمجھ کر بولی۔

"تم انہیں ایئرپورٹ چھوڑ سکتی ہو...... آخری بار......" اور وہ تپتا ہوا چہرہ لئے اندر چلی گئی۔

راستہ بالکل خاموشی سے کٹا...... کہنے سننے کو رہ ہی کیا ہو گیا تھا...... صرف ایک دوسرے کی موجودگی کا احساس تھا اور بس ایئرپورٹ پر اظہر نے شاداب کو الوداع کہنا چاہا۔ لیکن لب بس پھڑپھڑا کر رہ گئے اور وہ اپنے بے روح لاشے کو گھسیٹتا ہوا چل دیا۔

شاداب بے اختیار اس کے پیچھے لپکی مگر دو قدم چل کر رک گئی۔ اس کی بے پناہ اداسی کو دیکھ کر پاس کھڑی معمر عورت پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

"اتنی پریشان کیوں ہو۔ پردیس جا رہا ہے کیا؟؟"

اس نے اس کے سوال کو گویا سنا ہی نہیں۔ خود کلامی کے انداز میں بولی۔

"میرے بچوں کا باپ ہے۔"

"پگلی، تو یہ کیوں نہیں کہتیں۔ شوہر ہے تمہارا۔"

یہ سن کر اس کے ضبط کا بند ٹوٹ گیا اور وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

جہاز میں ساتھ کی سیٹ پر بیٹھے ہمسفر نے اظہر کی غیر حالت دیکھی تو پوچھا۔

"کیا بات ہے آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

اظہر نے خالی خالی نظروں سے اسے یوں دیکھا جیسے اس کی بات سمجھ نہ پایا ہو۔

"میں پوچھ رہا تھا خیریت تو ہے؟" ہم سفر نے اپنی بات دہرائی۔

"ہاں، دراصل میرا ماضی کھو گیا ہے۔"

"جی؟" ہمسفر نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے حیرت سے کہا۔

اور اس نے جیسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "ماضی کی بنیاد پر حال کھڑا ہوتا ہے نا...... اور حال کی بنیاد پر مستقبل۔" "جی، جی"۔ ہمسفر نے تائید کی۔

تو میں نے بتایا نا کہ میرا ماضی کھو گیا ہے۔ اس لیے میرے پاس نہ حال ہے نہ مستقبل...... میں بے زمینی اور بے زمانی کے کرب میں مبتلا ہوں...... عرصہ عذاب میں ہوں...... اس عذاب کو کوئی کیسے سمجھ سکتا ہے......

اس نے ایک گہری سانس لے کر آنکھیں بند کر لیں اور اپنے دہکائے ہوئے جہنم میں اتر گیا۔

انوکھی

وہ دونوں ایک ساتھ جہاز میں سوار ہوئے۔ انہوں نے ہیڈ ریک میں بڑی بیزاری سے ہینڈ بیگ پھینکے۔ سیٹوں پر بیٹھتے ہی بڑی تیزی سے یوں بیلٹیں باندھیں جیسے وہی تو ابھی جہاز کو اڑانے والے ہوں اور پھر دونوں مخالف سمتوں میں دیکھنے لگے۔ سلویا کھڑکی سے باہر اور فرید جہاز میں سوار ہونے والے مسافروں کو۔

پچیس سال پہلے سلویا جو سلویٰ تھی اور فرید، فرید تھا بالکل اسی طرح جہاز میں سوار ہوئے تھے اسی طرح ہینڈ بیگ پھینکے تھے۔ اضطراری کیفیت میں جلدی جلدی بیلٹیں باندھی تھیں اور ایک دوسرے کی مخالف سمتوں میں دیکھتے ہوئے اندیشہ ہائے دور دراز میں ڈوب گئے تھے۔

جہاز پرواز کرنے لگا تھا اور اب تو وہ اتنی بلندی پر تھا کہ سوائے بادلوں کے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ لیکن سلویا تب بھی کھڑکی سے باہر دیکھے جا رہی تھی۔ فرید کچھ دیر تو بے چینی سے اپنی نشست میں کسمساتا رہا۔ مگر جب سلویا کی بے اعتنائی سے اس کا اعصابی تناؤ ناقابل برداشت ہونے لگا تو اس نے پکارا...... ''سلویا!''

اور سلویا یوں چونکی جیسے گہری نیند سے بیدار ہوئی ہو۔

''تم ابھی تک ناراض ہو''۔ فرید نے ہتھیار ڈالنے والے انداز میں کہا۔

سلویا نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"میں نے اس کا حل سوچ لیا ہے۔ یوں کریں گے۔ پہلے تو ان کے گھر چلے جائیں گے وہ ایئر پورٹ پر لینے جو آئے ہوئے ہوں گے۔ وہاں تھوڑی دیر رک کر چائے وائے پی کر ہوٹل میں اٹھ آئیں گے۔ میں کہہ دوں گا میری کمپنی نے میرے لیے پہلے سے بکنگ کرادی تھی۔ ٹھیک ہے نا۔"

"ٹھیک ہے" سلویا مسکرادی۔

فرید نے ہلکے پھلکے ہوکر آنکھیں بند کرلیں اس کی گہری گہری سانسیں اس کے نیند کے آغوش میں چلے جانے کا پتہ دینے لگیں اور سلویا ایک بار پھر سوچوں میں ڈوب گئی۔

پچیس سال پہلے وہ گھر بار، عزیز رشتہ داروں، والدین، وطن سب کچھ چھوڑ کر نقل مکانی کر کے سات سمندر پار کولمبس کی سرزمین پر آبسے تھے نئے ملک نے ان سے پرائی سرزمین پر آباد ہونے کی ذہنی، جسمانی، جذباتی ہر قیمت وصول کی مگر یہ بھی ساری بھی ساری کشتیاں جلا کر آئے تھے۔ طویل تگ و دو کے بعد آخر کار یہ ہموار اور خوشحال زندگی گزارنے کے قابل ہوگئے۔

ان کے دو بچے علی اور صبا جوان ہوگئے تھے۔ علی تو کئی سال سے دوسرے شہر میں تھا وہاں پہلے اس نے تعلیم مکمل کی اور اب ملازمت بھی کرتا تھا اور ساتھ ساتھ پڑھ بھی رہا تھا۔ گریجویشن کے بعد چھ ماہ پہلے بیٹی کی شادی بھی ہوگئی تھی۔ اور اب یہ دونوں میاں بیوی اکیلے تھے۔

جب سے صبا کی شادی ہوئی تھی۔ فرید کو گویا رٹ لگ گئی تھی کہ چلو واپس وطن چلتے ہیں بہت پردیس کاٹ لیا ہے۔ یہاں اتنا عرصہ گزارنے اور اچھا خاصا گھل مل کر رہنے کے باوجود اس کی اس ملک سے اجنبیت قائم تھی اور جس کا وہ ہمیشہ ذکر کرتا رہتا تھا۔ اصل میں وہ ذہنی طور پر خود کو وہیں وطن میں چھوڑ آیا تھا اور اب اپنی ذمہ داریوں سے نپٹنے کے بعد وہ اپنے مکمل وجود کے ساتھ باقی عمر گزارنا چاہتا تھا۔ اس سلسلے میں اس نے عملی اقدامات بھی شروع کردیے تھے وہ اپنے ایک پرانے دوست کی شراکت میں وہاں کاروں کے پارٹس تیار کرنے کی فیکٹری لگانا چاہتا تھا۔ ابتدائی کام اور کاغذی کارروائیاں مکمل ہوچکی تھیں۔ زمین خریدی جاچکی تھی اب وہ اسی سلسلے میں وہاں جارہے تھے کہ اگلے مراحل کا پلان بھی بنالیا جائے اور وہ ہر چیز کا بچشم خود معائنہ بھی کرتا کہ کوئی کمی نہ رہے۔

سلویا عجیب گومگو میں تھی۔ اس ملک میں جدوجہد کے ابتدائی سالوں میں انہیں کئی شہر کئی ریاستیں بدلنی پڑیں۔ مسلسل ہجرتوں نے اس سے جگہوں کی وابستگی چھین لی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ دراصل وہ کہاں سے تعلق رکھتی ہے اسے لگتا ہر جگہ ہر مقام عارضی ہے۔ بے گھری و بے دری کے اس احساس نے اس کے اندر ایک خلا ایک بے چینی سی پیدا کر دی تھی اسے لگتا اس کا کسی جگہ کسی خطہ وزمین سے کوئی تعلق نہیں ہے وہ وطن واپس جارہی یا ایک نئے پردیس میں جا رہی ہے۔ اتنے طویل عرصے کی دوری نے وہاں کے لوگوں سے قربت کا احساس ختم کر دیا تھا کہ تعلق تو قربت ہی میں پنپتے ہیں۔ اسے فرید پر رشک آتا کہ وہ خود پر کتنا واضح ہے۔ وہ فرید کو اتنا خوش دیکھ کر اسے یاد دلاتی، فرید ہمارے بچے یہاں ہیں۔''

''ہم یہاں اپنا گھر نہیں بیچیں گے۔ جب دل چاہے آجانا جتنا عرصہ مرضی آئے رہ لینا۔ کوئی پابندی ہے کیا۔'' وہ اسی ترنگ میں خوشی خوشی کہتا۔

''اور تم؟'' وہ غیر یقینی لہجے میں کہتی۔

''میں بھی چکر لگایا کروں گا ایسی کوئی بات نہیں۔ کبھی بچوں کو وہاں بلا لیا کریں گے۔ اللہ کا فضل ہے فکر کس بات کی ہے۔'' وہ اسے دلجمعی سے کہتا۔

سلویا چپ ہو جاتی۔

''یوں ماتمی صورت نہ بناؤ۔ ابھی تو ہفتے دس دن میں واپس آجائیں گے یہاں سے وائنڈ اپ کرنے میں بھی کچھ وقت لگے گا۔'' اس نے تسلی آمیز انداز میں اس کے گال تھپتھپائے۔

پرواز ناہموار ہوگئی تھی وہ جھٹکوں سے چونک کر پھر سے جہاز میں لوٹ آئی۔ فرید نے چونک کر آنکھیں کھولیں مگر دوسرے ہی لمحے پھر سے بند کر کے سوگیا۔

نیند بھی کتنی بڑی دولت ہے کتنا پرسکون ہے یہ شخص، مگر یہ بے چینی اس کے دل میں کیوں گھر کرگئی ہے۔

سلویا کی تقریباً وہی کیفیت تھی جو پچیس سال پہلے وطن چھوڑتے ہوئے تھی۔ تب تو اجنبی جگہ اور ان دیکھے مسائل کا خوف تھا۔ اب وہ کیوں گھبرا رہی ہے؟ کیا واپس لوٹنا بھی آگے بڑھنے جیسا مشکل اور تکلیف دہ ہوتا ہے؟ کیا وقت اور فاصلہ دیکھی بھالی، جانی پہچانی چیزوں

کے درمیان بھی اجنبیت کا پردہ حائل کر دیتا ہے؟ ان دیکھے خوف بھر دیتا ہے؟ یہی سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی۔

کھانے کیلئے فرید نے اسے جگایا اور اس کے اداس چہرے کو دیکھ کر بولا۔ ''بھئی۔ اب تو خوش ہو جاؤ کہ جیت تریاہٹ کی ہوئی ہے۔''

وہ اسے شکایتی انداز میں دیکھتے ہوئے مسکرا دی کہ یہ فرید بھی جانتا تھا کہ وہ ضدی نہیں تھی مگر سالہا سال سے اکیلے دور اور پھر بیرون ملک کے ماحول میں رہنے کی وجہ سے اسے یہ بہت بھاری لگ رہا تھا کہ وہ بے دیکھے بھالے انجان لوگوں کے گھر جا کر رہنے لگ جائے۔ ہفتہ دس دن کوئی کم عرصہ نہیں ہوتا۔ خود بھی بے آرام، دوسرے بھی بے آرام۔ فرید کی عاصم سے بے تکلفی ہے اس لیے اسے تو کوئی قباحت نظر نہیں آ رہی۔ کیا معلوم بیوی کس مزاج کی ہو۔ چلو اچھی بھی ہو تو بھی کسی پہ اتنے دن مہمانداری کا بوجھ بہت ہے۔ لیکن یہ بات فرید کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ لیکن اس کی ناراضگی کو دیکھتے ہوئے آخر کار وہ مان گیا۔

ائیر پورٹ پہ اکیلا عاصم آیا ہوا تھا اس کی بیوی گھر پہ ان کا انتظار کر رہی تھی۔ گھر پہنچے تو مسز عاصم اسے بہت جانی پہچانی سی لگی۔ اس کی آواز، اس کی چال ڈھال، سب کچھ۔

پچیس تیس سال بہت ہوتے ہیں۔ بہت کچھ بدل جاتا ہے۔ وہ کچن میں گئی سلویا سوچنے لگی اور اسے یاد آ گیا کہ وہ تو اس کے ہائی سکول کی ہم جماعتوں میں سے ہے مگر نام یاد نہیں آ رہا تھا۔ تبھی وہ ہنستی ہوئی لوٹی اور بولی۔

''ارے...... یہ تم سلویا کب سے بن گئیں من وسلویٰ!'' وفا اکثر اسے سلویٰ کے بجائے من وسلویٰ کہتی تھی۔ ادھار تو یہ بھی نہ رکھتی تھی۔ ''اچھا تو یہ تم ہو بے وفا''

اور وہ دونوں جو گلے ملیں تو کتنی ہی دیر لپٹی رہیں اور پھر جو باتوں کا سلسلہ دراز ہوا ہے تو انہیں وقت کا کچھ خیال ہی نہیں رہا۔

حسب وعدہ فرید بلانے آیا کہ چلو ہوٹل چلتے ہیں۔ ائیر پورٹ سے آتے ہوئے راستے میں ہی فرید نے عاصم کو بتا دیا تھا اور تھوڑی بہت رد و کد کے بعد وہ مان گیا تھا۔

''کمپنی والوں سے کہہ دو کہ ہم یہ سہولت پھر کبھی لے لیں گے۔'' سلویا ہنستے ہوئے بولی۔

اور فرید ہکا بکا رہ گیا۔ تب بھید کھلا کہ وہ تو سکول کی پرانی ہم جماعتیں ہیں اور وہ مطمئن ہو کر اپنے کام پر چلے گئے۔

وفا اور سلوئی قریبی گہری سہیلیاں نہیں تھیں۔ بلکہ وفا کسی کی بھی قریبی دوست نہ تھی۔ طالب علمی کے زمانے میں وفا شوخ و شنگ اور حاضر جواب لڑکی تھی۔ ذہین بھی بلا کی تھی۔ پڑھائی لکھائی، کھیل، ڈرامے، تقریریں ہر چیز میں پیش پیش، اگرچہ سکول میں یونیفارم تھا۔ پھر بھی اس کی سج دھج اور انداز نمایاں تھا۔ ان سب خوبیوں کے باوجود وہ کسی کی قریبی دوست نہ تھی بس سب سے مشترکہ گپ شپ تھی۔ کبھی کبھی اس کی غیر موجودگی میں دبی دبی سرگوشیاں ہوتیں کہ وہ نہ کسی کے گھر جاتی ہے اور نہ ہی کبھی کسی کو گھر بلاتی ہے۔ یوں تو اتنی سوشل ہے۔ پتہ نہیں کیا ہے۔ عجیب سی فیملی ہے۔

ہائی سکول تک تو وہ ان کے ساتھ تھی۔ مگر کالج ان کے ساتھ نہ گئی۔ پھر سنا کہ وفا کی شادی ہو گئی ہے۔

''ارے اتنی جلدی'' سب کو حیرت سے زیادہ صدمہ ہوا۔ ''ہاں وہ عجیب سی ہی فیملی تھی۔ اس نے کسی کو شادی میں بھی نہیں بلایا۔'' کوئی معلومات میں اضافہ کرتی۔ ارے یاد نہیں اس کے مڈل میں فرسٹ آنے اور وظیفہ لینے پر کتنا دعوت کے لیے اصرار کیا تھا مگر وہ کیسے ٹال گئی تھی۔ پتہ نہیں گھر کیوں نہیں آنے دیتی تھی، پتہ نہیں کیا چکر تھا۔''

دوسری تبصرہ کرتی۔

''اسی لیے تو دوست نہیں بناتی تھی'' تیسری دلیل دیتی۔

''کیا چکر ہو سکتا ہے، دیکھنے میں تو ٹھیک ٹھاک تھی۔'' کسی کو ترس آ جاتا اس پر۔

اصل میں ان سب کو افسوس تھا کہ ایک ہی شہر میں ہوتے ہوئے اس نے کسی کو اپنی شادی میں نہیں بلایا تھا گہری دوستی نہ سہی سب سے اچھی خاصی سلام دعا تھی۔ آہستہ آہستہ وہ ذہنوں سے محو ہو گئی۔

اور آج سلوئی اس کے گھر بیٹھی تھی۔ یہ سب باتیں اس کے ذہن میں گھوم رہی تھیں اور اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ کبھی ایسا بھی ہو سکتا تھا۔

خوشحالی اس کے گھر بار رہن سہن سے ٹپک رہی تھی اور ویسے بھی انہیں معلوم تھا کہ وہ وطن

میں رہتے ہوئے ان سے زیادہ کامیاب تھے۔ جبکہ وہ سالہا سال پردیس میں ٹھوکریں کھا کر اور کئی ذہنی و جذباتی خسارے اٹھا کر اس مقام تک پہنچے تھے۔ وفا کی دو بیٹیاں تھیں جو اپنے گھر بار کی ہو چکی تھیں۔ اب یہ میاں بیوی بھی انہیں کی طرح اکیلے تھے۔

باقی تو سب ٹھیک تھا لیکن اسے ایک بات بہت عجیب لگی۔ وفا کا رویہ اپنے شوہر کے ساتھ عجیب غلامانہ تھا وہ اس کے لیے فنا ہوئے جاتی نثار ہوئے جاتی اور وہ اسے اپنا حق سمجھ کر وصول کرتا لیکن اس کے ماتھے پر شکن تک نہ آتی۔ سلویا کو بہت کوفت ہوتی۔ آخر اس سے رہا نہ گیا۔

"اری پاگل! تو تو اس کے قدموں میں یوں بچھی جاتی ہے جیسے بیوی نہ ہو زر خرید کنیز ہو۔ میرا تو خیال ہے کنیزیں بھی ایسا نہیں کرتی ہوں گی۔ کیا کمی ہے تجھ میں بتا۔"

جواباً وہ مسکراتی رہتی مگر اس پر کچھ اثر نہ ہوتا۔

عاصم یوں تو عادت اخلاق میں ٹھیک ٹھاک ہی تھا مگر سلویا کو خاص اچھا نہ لگا۔ عملی لیکن سطحی سا آدمی تھا۔ کھانے کی میز پر بات چیت سے اندازہ ہوتا۔ ورنہ زیادہ وقت تو فرید اور عاصم باہر ہی مصروف رہتے۔

سلویا اور وفا آپس میں مگن رہتیں۔ خوب خوب پرانی باتیں دہرائی جاتیں۔ اب اگرچہ وفا کافی سنجیدہ ہو گئی تھی مگر فطری شوخی کی ابھی بھی جھلک موجود تھی۔ "تو نے نام کیوں بدل لیا من و سلویٰ؟" وفا نے پوچھا۔

"بے وفا! اس لیے کہ کام پر میرے ساتھی مجھے سلویا پکارنے لگے، انہیں سلویٰ کہنا مشکل لگتا تھا۔ فرید کو پسند آ گیا یہ نام اور گھر میں بھی سب سلویا کہنے لگے اور یہی نام مشہور ہو گیا۔ کام پر فرید کو بھی فریڈ بلاتے ہیں مگر گھر پر فرید ہی ہے۔"

"اچھا اچھا میں تو سمجھی مذہب بدل لیا ہے...... میم صاحب بن گئی ہیں۔"

اور وہ دونوں ہنسنے لگیں اور پھر بچپن کی شرارتیں اور ٹیچروں کی باتیں شروع ہو گئیں پھر وفا سب ٹیچروں کے لہجے اور آواز کی نقلیں اتارنے لگی۔ کم بخت کو ان کے فقرے تک یاد تھے۔ ہنس ہنس کے دونوں کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔

"ایک زمانے بعد اتنا ہنسی ہوں، شکر ہے تم فرید بھائی کے ساتھ آ گئیں...... کتنے اچھے

گزرے ہیں یہ دن۔" وہ گہرا سانس لے کر بولی۔ پھر وہ تصویریں دیکھنے لگیں۔ تصویریں دکھاتے ہوئے وفا اپنی بچیوں کے حسن و ذہانت کا بڑے فخر سے ذکر کرتی رہی۔

"سب تم سے لیا ہے انہوں نے" سلویا نے صدق دل سے کہا۔

"نہیں، نہیں مجھ میں کوئی خوبی نہیں ہے اپنے ددھیال پر گئی ہیں۔"

"بڑا انکسار برتا جا رہا ہے" سلویا مسکرائی۔

"سچ یہی ہے بہنا۔ مجھ میں تو کچھ بھی نہیں خالی ہوں بالکل" اور ایسا کہتے ہوئے اس کے چہرے پر دلی سچائی کے علاوہ محرومی سی تھی۔"

"پتہ نہیں وہ اپنی ذات کی اتنی نفی کیوں کرتی تھی۔"

سلویا کو فرید نے بتایا کہ عاصم کو دوسری شادی کا بہت شوق ہے۔ حالانکہ ادھر ادھر منہ بھی مارتا رہتا ہے۔ اس کے دل کو چوٹ لگی۔

"ہائے ہائے تبھی بیچاری اتنے جتن کرتی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے اس پاگل نے اپنی ہستی کو مٹا کر اپنی وقعت کھو دی ہے۔ اس کے ساتھ آقاؤں جیسا سلوک کرتی ہے تو شاید اسے ساتھی کی کمی محسوس ہوتی ہوگی"

شاید یہی ہو۔ وہ کہتا ہے کہ وہ ہر بات اسے بتا دیتا ہے اس نے تو اسے یہ تک کہہ دیا ہے کہ وہ دوسری شادی کرنا چاہتا ہے۔"

"اتنی اچھی بیوی کے ہوتے ہوئے" وہ افسوس سے سر ہلانے لگی۔

"مگر تمہاری دوست کا دل بہت بڑا ہے۔ اس نے عاصم سے کہا ہے کہ تمہاری خوشی میری خوشی ہے۔ کہہ رہا تھا۔ میری بیوی کو بڑی محبت ہے مجھ سے۔"

"تو یہی صلہ دے رہا ہے اسے" سلویا بولی۔

"بالکل یہی بات میں نے بھی کہی تھی۔"

"پھر کیا بولا؟"

کہنے لگا "یار اللہ نے بہت دے رکھا ہے اس کا بھی پورا پورا حق ادا کرتا رہوں گا۔ پہلے بھی کبھی کوئی کمی نہیں دی اور عورت کو کیا چاہئے۔"

"اس معاملے میں دیوالیہ ہے، وہ عورت سے محبت کا کوئی ٹھوس تصور ہی نہیں ہے اس

کے پاس عورت کے معاملے میں"

"بچاری وفا!" وہ بہت دکھی ہوگئی۔

"مگر شدید خواہش کے باوجود وہ شادی نہیں کرے گا...... فکر نہ کرو۔"

"کیسے معلوم ہے تمہیں؟" سلویا نے بے صبری سے پوچھا۔

"باپ وہ بہت اچھا ہے۔ کہہ رہا تھا کہ بچیاں برا مانیں گی ان کی سسرال میں عزت خراب ہوگی ان کے شوہروں کو ایک مثال مل جائے گی۔ ایک بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی کی۔ اور میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی میری بچیوں کو طعنہ دے۔ اسی لیے کلیجے پر پتھر رکھ لیا ہے۔ ورنہ کیا مشکل تھی۔ وہ بھاگوان تو راضی ہے۔ اللہ کا دیا بھی سب کچھ ہے، بس اولاد کے لیے قربانی دے رکھی ہے۔"

ہائے کیسی ہے یہ وفا؟ وہ ایسی کیوں ہے؟ کچھ تو پتہ چلے۔ وہ تو بچپن سے ہی بھیدوں بھری تھی تب نہ کھلی تو اب تو وہ ایک معتبر خاتون ہے۔ ممکن ہے برا مانے پوچھنے کا سمجھانے کا مگر اس نے ہمت کر ہی لی وہ وہاں ان کے قیام کی آخری رات تھی۔ عاصم اور فرید کا کچھ کاروباری لوگوں کے ساتھ ڈنر تھا۔ کھانے کے بعد دونوں قالین پر پھسکڑا مارے بیٹھی کیسٹوں میں سے اپنی اپنی پسند کے گانے چن رہی تھیں۔ تبھی سلویا بولی۔ "چھوڑو نہیں...... سنو وفا، ایک بات کہوں ...... مانو گی؟"

"ایک نہیں دو کہو، ضرور مانوں گی۔" وفا خوش دلی سے بولی۔

"تم یوں عاصم بھائی کی غلامی نہ کیا کرو...... بیوی ہو ان کی، برابری سے رہو، جیسے ہم رہتے ہیں۔ تم بھی خوش رہو گی اور وہ بھی خوش رہیں گے۔"

"ٹھیک ہے...... اور کچھ؟" وہ ہنسی۔

"نہیں وفا...... بات کو مذاق میں نہ اڑاؤ" سلویا اداسی سے بولی۔

وفا نے اسے دیکھا اور وہ بھی اداس ہوگئی۔

"میں کیسے مانوں کہ تم ایسی ہی پتھر ہو کہ کچھ محسوس ہی نہیں کرتیں، عزت نفس بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔"

"جانتی ہوں بہنا، میری مجبوری یہ ہے، میری مجبوری یہ تھی، معلوم نہیں میری کیا مجبوری

تھی۔ مجھے کچھ نہیں معلوم کوئی خاص بات نہیں۔" وہ باہر آتے آتے پھر بل میں جا گھسی۔

"تم نے کبھی کوئی دوست بنائی؟"

"نہیں"

"کیوں؟"

وہ چپ رہی۔

"کسی پر اعتبار نہیں آیا نا"

"شاید" اس نے تقریباً سرگوشی میں کہا۔

"مجھ پر اعتبار کر کے تو دیکھو، کسی کو اپنا بنا کے تو دیکھو، کسی سے کچھ تو کہو تمہارا دم نہیں گھٹتا۔"

وہ چپ رہی۔

"شاید میں نے اپنی اوقات سے زیادہ بات کر دی ہے۔ یقیناً میں اس قابل نہیں ہوں"

سلویا کا دل بھر آیا۔

"نہیں ایسا نہیں ہے" وہ تڑپ کر بولی۔ "لو زندگی میں پہلی بار تمہیں بتاتی ہوں اور وہ بولتی چلی گئی اس نے دل کھول کر سامنے رکھ دیا۔ میں تین بھائیوں کی اکیلی بہن ہوں۔ میری ماں مجھے جنم دیتے ہوئے اس دنیا سے گزر گئیں۔ مجھے نہیں معلوم ماں کیا ہوتی ہے۔ ہمارے ابا نے دوبارہ شادی نہیں کی۔ کوشش تو انہوں نے بہت کی مگر متوسط مالی حیثیت اور چار بچوں کے ہوتے ہوئے کہیں بات طے نہ پا سکی۔ وہ بہت چڑ چڑے مزاج کے تھے یا ہو گئے۔ ہر وقت ہم بچوں کے پیچھے پڑے رہتے۔ بھائی تو اس گھٹن سے گھبرا کر زیادہ وقت گھر سے باہر گزارتے اور ان کی غصہ ناراضی، چڑ چڑا پن سب مجھے سہنا پڑتا تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ میٹرک کے بعد میری شادی ہو گئی۔ تم تو جانتی ہو میں نے وظیفہ لیا تھا میٹرک میں...... مگر میرے رونے پیٹنے کے باوجود انہوں نے آگے نہ پڑھنے دیا۔ وہ جلد سے جلد ہم سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔"

"پھر انہوں نے شادی کر لی؟"

"ہاں!" اس نے مختصر جواب دیتے ہوئے ایسے انداز میں ہاتھ ہلایا جیسے وہ اس سلسلے

میں مزید کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔

وہ سمجھ گئی کہ یہ اس کے لیے تکلیف دہ موضوع ہے اس لیے اس نے بھی اس کے بھائیوں یا سوتیلی ماں کی بابت نہ پوچھا۔

''میں نے تو صرف فرائض دیکھے ہیں، فرائض نبھائے ہیں اور فرائض ہی کی زبان سمجھی ہے اور میں کچھ نہیں جانتی۔'' وہ بول تو رہی تھی مگر جیسے خود وہاں موجود نہ تھی۔

''کیسی باتیں کرتی ہو وفا...... اب تو تم خود ماں ہو۔ اب تو تمہیں معلوم ہو ہی گیا ہوگا، ماں کیا ہوتی ہے۔''

''ہاں، میں نے بچوں کی بھی جی جان سے خدمت کی ہے اپنے فرض میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔''

''بچے تم سے پیار کرتے ہیں نا؟''

''ہاں!''

''اور تم؟''

''میں بھی بہت پیار کرتی ہوں۔'' وہ سلویا کی گھبراہٹ آمیز حیرت پر مسکرائی۔

''یہ تو فطری ہے۔''

''یہی سنا ہے۔'' وہ عجیب انداز میں ہنسی۔

''شادی کے بعد کیا ہوا...... میرا مطلب ہے عاصم کے ساتھ کیسا تعلق ہے۔'' سلویا نے بات بڑھائی۔

''شادی کے بعد کیا ہوتا، عاصم جیسے ہیں تمہارے سامنے ہیں۔ شروع سے ہی ایسے تھے میں کچھ بھی کر گزرتی، کبھی نہ سراہتے۔ ہاں کوئی کمی رہ جاتی تو ٹوکنے، جتانے اور طعن و طنز میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے۔

اور...... اور...... پھر...... پھر میں نے سوچا کہ چلو مجھے تو جو میرا نصیب تھا مل گیا، میری ذات سے اگر کسی کو کوئی خوشی مل سکتی ہے وہ تو دوں، کوئی ایک تو خوش ہو۔ پھر میں عاصم سے عشق کرنے لگی اور اب مجھے کچھ بھی برا نہیں لگتا۔ کوئی توقع جو نہیں ہے۔'' وفا بڑے سکون سے دھیرے دھیرے بولتی رہی۔

''پاگل اسے عشق کہتے ہیں اور پھر عزت نفس بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔''

''میں نے تو یہی سنا ہے کہ عشق اپنی ہستی مٹا دینے اور جواباً کوئی توقع نہ کرنے کو کہتے ہیں۔'' وہ بولی۔

سلویا کو سچ مچ غصہ آنے لگا۔ اتنی عمر گزارنے کے بعد بھی اتنی بھولی بنی بیٹھی ہے۔ کوئی خود بیوقوف بنے تو دوسرے کو کیا تکلیف ہے کہ فائدہ نہ اٹھائے۔ پیروں میں بچھو گے تو ہر کوئی روند کے ہی تو گزرے گا۔ مگر اس نے اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''ہر بات سنی ہے تم نے، خود کچھ نہیں جانتیں۔ سننے کو چھوڑو...... تمہارا دل کیا کہتا ہے...... تمہیں کیسا لگتا ہے؟''

اور وہ منظر سلویا کی نظروں میں ٹھہر سا گیا۔

وہ اپنے گھٹنوں کو بازوؤں کے حلقے میں لیے ان پر ٹھوڑی ٹکائے بیٹھی تھی اس نے اپنی نظریں اٹھائیں اور سلویا کے چہرے پر جما دیں۔ وہ آنکھیں بول رہی تھیں۔ داستاں در داستاں۔ وفا نے تو اپنی زبان سے کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ مگر اس کی آنکھوں میں کروٹیں لیتے کرب کی تپش سے سلویا کا چہرہ جلنے لگا۔ وفا کے لب کچھ کہنے کے لیے پھڑ پھڑائے۔ مگر کوئی آواز نہ نکلی۔ پھر اس کی آنکھوں میں ایک ایسا تاثر ابھرا جو سارے کربوں کا مجموعہ تھا۔ عجیب سی بے بسی...... اور پھر وہ گھٹی گھٹی آواز میں رک رک کر بولی۔

''مجھے نہیں پتہ، کیسا لگتا ہے...... مجھے نہیں معلوم...... میں اسے محسوس نہیں کر سکتی۔'' اس کی جلتی ہوئی آنکھوں سے سلگتے ہوئے دو موٹے موٹے آنسو ابلے اور ٹپک کر قالین میں جذب ہو گئے۔

سلویا کو لگا کہ اگر وہ ان آنسوؤں کو چھوتی تو اس کے ہاتھ جل جاتے۔ وہ سن سی رہ گئی۔

یہ کیسے ممکن ہے؟

تو کیا اس جذبے نے اس کے دل میں جنم ہی نہیں لیا؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ فطری ہے یہ تو......'' سلویا حیرت سے گنگ ہو رہی تھی۔

مگر وفا کی آنکھیں سچ بول رہی تھیں۔

وہ بھاری دل لیے وہاں سے چلی آئی۔

...

اور آج فرید نے بتایا کہ مسز عاصم کا انتقال ہو گیا ہے...... وفا مر گئی ہے...... فرید نے تفصیل بتائی......

اس روز عاصم کی سالگرہ تھی۔ بیٹیاں بھی آئی ہوئی تھیں۔ وفا بیٹیوں کو بتا گئی کہ وہ عاصم کے لیے سالگرہ کا تحفہ لینے جا رہی ہے۔ گھر سے نکلتے ہی سڑک پار کرتے ہوئے ایک گاڑی کی زد میں آ گئیں۔

سلویا کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا...... سالگرہ کا تحفہ...... اسے یقین تھا کہ یہ ایکسیڈنٹ نہیں تھا۔

اور آنسوؤں کی بوچھاڑ میں دھندلاتے منظر اور دھندلاتے ذہن میں وفا کی تصویر گھوم گئی۔ وہ سوچ رہی تھی...... کیسا انوکھا تحفہ دیا اس نے...... کیسی انوکھی تھی یہ وفا بھی......

چارہ گر

نادرہ نے دعا مانگ کر اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرے۔ ایک گہری سانس چھوڑتے ہوئے نگاہ آسمان کی طرف اٹھائی مگر وہاں بھی نظر اس کے مقدر کی طرح پتھریلی چھت سے ٹکرا کر لوٹ آئی۔ اس نے جائے نماز کا کونہ الٹا اور دوپٹے کے پلو سے اپنی بھیگی آنکھیں پونچھنے ہی لگی تھی کہ دفعتاً کمرے کا دروازہ کھلا اور اس کا پچیس سالہ نوجوان بیٹا ساجد برآمد ہوا۔ اس نے دوپٹے کا پلو چھوڑ دیا اور اس سے نظریں بچاتے ہوئے جاء نماز کا الٹا ہوا کونہ پھر سے سیدھا کر کے ہاتھوں سے سلوٹیں درست کرنے لگی۔

''امی!'' ساجد نے ماں کو مخاطب کیا۔

''جی بیٹے!'' اس نے اپنی آواز کی بھراہٹ پر قابو پاتے ہوئے نارمل لہجے میں کہا۔

''خالہ کا خط آیا؟'' ساجد کے سوال میں امیدوں کی کتنی ہی کونپلیں سانس لے رہی تھیں۔

''نہیں بیٹے! ابھی تو نہیں آیا۔ تمہیں معلوم ہے وہ کتنی لاپرواہ اور لاابالی طبیعت کی ہے، لکھنے پہ آئے تو ہر چوتھے دن خط چلا آ رہا ہے اور نہ لکھے تو مہینوں بیت جائیں مگر دھیان تو برابر اس کا ہماری طرف لگا رہتا ہے، اور......''

اور بات کو درمیان میں چھوڑ کر انہوں نے پھر سے نفلوں کی نیت باندھ لی۔ غالباً ساجد کے ان سوالوں سے بچنے کے لیے جس کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا اور پھر اس سے ساجد کے چہرے کی مایوسی بھی تو نہیں دیکھی جاتی تھی جس کو حتی الامکان چھپانے کی کوشش کرتا تھا پھر بھی وہ بھانپ لیتی تھی۔ ساجد ماں سے تفصیلی گفتگو کے انتظار میں وہی ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ گیا۔

ساجد کی کمسن حسین وجمیل بیوی میشا جلے پاؤں کی بلی کی طرح بے چین ادھر ادھر گھومتی پھر رہی تھی۔ کبھی باورچی خانے میں جا گھستی۔ کبھی کمرے میں، کبھی بیٹھک میں، کبھی پہلے سے ترتیب سے رکھی ہوئی چیزوں کو ہلا جلا کر پھر سے رکھنے لگتی، کبھی خواہ مخواہ ہی جھاڑ پونچھ کرنے لگتی، کبھی الماریوں اور دروازوں کو کھولنے اور چیزوں کو الٹ پلٹ کرنے لگتی۔ ابھی کچھ دیر سے وہ کمرے میں گھسی پتہ نہیں کیا کھٹ پٹ کئے جا رہی تھی۔ وہ پھر کمرے سے نمودار ہوئی اور میاں سے بولی۔

''شکنجبین بنا دوں آپ کو؟''

''نہیں رہنے دو۔'' ساجد نے لاپروائی سے جواب دیا۔

''نہیں پی لیں تو اچھا ہے۔ تھوڑی تازگی آ جائے گی طبیعت میں۔'' میشا نے اصرار کیا۔

''چلو بنا دو۔'' ساجد نے اپنے اضطراب اور بیزاری کو دباتے ہوئے اس کا دل رکھنے کو کہہ دیا۔

میشا باورچی خانے میں گئی مگر فوراً ہی نکل آئی۔

''لیموں تو ہیں ہی نہیں، میں جلدی سے لے آتی ہوں۔''

''نہیں، ایسا بھی کوئی ضروری نہیں، اب کہاں جاؤ گی اکیلی گرمی میں۔'' ساجد نے کہا۔

''یہ تو مارکیٹ ہے۔ بس ابھی لپک کر لے آتی ہوں۔ کوئی خاص گرمی نہیں ہے اور پھر لیموں گھر میں رکھے رہیں تو اچھا ہے۔ وقت بے وقت مہمان آ جاتے ہیں اور اس موسم میں پانی وانی تو لازمی ہی پوچھنا پڑتا ہے۔''

میشا نے پوری بات اتنی سنجیدگی سے بڑی بوڑھیوں کے انداز میں کہی کہ ساجد کے

چہرے پر مسکراہٹ آ گئی، اس نے اپنی بیوی کے خوبصورت چہرے کو بڑی میٹھی نظروں سے دیکھا لیکن وہ چادر اوڑھ پلٹ کر دیکھے بغیر نکل گئی۔ یشا تو ایسی جلدی میں تھی جیسے پیچھے سے سیلاب آ رہا ہو۔ یہ سوچ کر وہ ایک بار پھر مسکرا دیا اور ساتھ ہی اداسی کی ایک لہر گہری بہت گہری اس کے اندر اترتی چلی گئی۔

ادھر امی کے نفل تھے کہ ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہے تھے۔ وہ اکتا کر کمرے سے کوئی کتاب لینے چلا گیا اور چند ہی منٹوں بعد جب وہ لوٹا تو امی دوپٹہ تانے سو رہی تھی۔ اس نے آہستہ سے پکارا۔ ''امی!''

مگر امی نے کوئی جواب نہ دیا۔

''اتنی جلدی کیسے نیند آ جاتی ہے ان کو؟'' وہ بڑبڑایا۔

اور امی سوتی بنی رہیں۔ ان کے آنسو بہہ بہہ کر ہتھیلی پر جمع ہوتے رہے اور ذہن ماضی و حال کی پگڈنڈیوں پر بھٹکتا رہا۔ مستقبل سے تو وہ اس درجہ خائف تھیں کہ ادھر دھیان جاتے ہی ذہن جیسے کام کرنا چھوڑ دیتا اور وہ خالی الذہن ہو جاتیں۔ نادرہ کی زندگی بڑی سادہ اور ہموار گزری تھی اسے اندازہ ہی نہ تھا کہ نشیب و فراز کے حقیقی معنی کیا ہوتے ہیں۔ وہ کوئی بہت متمول لوگ نہیں تھے مگر ابا اپنے مختصر کاروبار سے اتنا ضرور کما لیتے تھے کہ وہ اس کی چھوٹی بہن عنقا اور اماں ابا۔ یہ چھوٹا سا کنبہ بڑی آرام دہ زندگی گزار رہا تھا وہ سادہ سے ذہن کی لڑکی تھی اس کی کوئی لمبی چوڑی خواہشات نہیں تھیں جو مل جاتا اسی میں خوش ہو جاتی لیکن اس کی کوئی معصوم خواہش ایسی نہ تھی جو پوری نہ ہوئی ہو۔ عنقا البتہ اس سے بہت مختلف تھی۔ پتہ نہیں کیسی خوابوں، خیالوں جیسی باتیں کرتی اور کیا کیا سوچتی رہتی پھر نادرہ کی شادی ہو گئی۔ شاہد محمود نے اس کی معصومیت کی قدر کی اور بہت پیار دیا۔ اللہ نے دو خوبصورت بیٹے عادل اور ساجد دیئے۔ زندگی یہاں بھی بہت ہموار اور آرام دہ تھی۔

مگر شاید قدرت نے اس کے حصے کے سارے دکھ ایک ساتھ دینے کے لیے جمع کر رکھے تھے۔ اب جبکہ بچے جوان ہو گئے تھے بڑے بیٹے عادل نے تعلیم مکمل کر لی تھی اور اسے ملازمت بھی مل گئی تھی۔ ساجد کی تعلیم مکمل ہونے والی تھی اور اس کی شادی بھی ہو چکی تھی اور گڑیا

سی میشا اس کے گھر کی رونق بن کر آ گئی تھی۔

صرف سال بھر بعد اس کے ہنستے کھیلتے گھرانے پر یہ خبر بجلی بن کر گری کہ ساجد بلڈ کینسر جیسے موذی اور جان لیوا مرض میں گرفتار ہو گیا ہے۔ پھر ستم بالائے ستم یہ کہ اولتے بدلتے سیاسی حالات کی وجہ سے میاں ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ان کی تنخواہ ہی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ تھی جس سے اتنا مہنگا علاج دوا چل رہا تھا۔ عادل کی تنخواہ سے تو گھر کا چولہا ہی بمشکل تمام گرم رکھا جا سکتا تھا اور اس بار تو مہینہ گزر چلا تھا، عنقا کی طرف سے بھی خاموشی تھی۔ ڈھیٹ بن کر اس نے خط بھی لکھا مگر ابھی تک کوئی جواب نہ آیا تھا۔

ساجد کی نظریں کتاب پر تھیں مگر اس کا دھیان میشا کی طرف لگا ہوا تھا۔ پتہ نہیں اسے دیر کیوں ہو گئی تھی۔ میشا کا چہرہ ذہن میں آتے ہی اسے وہ دن یاد آ گیا جب اس نے پہلی بار اسے دیکھا تھا۔ وہ امی کے کسی کزن کی بیٹی کی شادی تھی۔ مہندی پر صرف عورتیں مدعو تھیں۔ لڑکے ادھر ادھر سے تاکا جھانکی کرتے پھر رہے تھے مگر ساجد ان لڑکوں میں شامل نہیں تھا وہ تو کسی ضروری کام سے امی کے پاس گیا تھا۔ خوب محفل جمی ہوئی تھی۔ ایک دبلی پتلی لڑکی اتنی شد و مد اور محنت سے ناچ رہی تھی کہ اسے ہنسی آ گئی۔ وہ پلٹنے ہی والا تھا کہ لڑکی گھومی۔ اب وہ پوری کی پوری اس کی نظروں کے سامنے تھی۔ بڑی بڑی چمکیلی سبز آنکھوں والی وہ لڑکی بالکل کانچ کی گڑیا جیسی تھی اور اس کا دل چاہا کہ وہ اسے ناچنے سے روک دے کہیں وہ سچ مچ ہی نہ ٹوٹ جائے اور پھر تو وہ جیسے اس کے دل میں اترتی چلی گئی۔

ہنستی مسکراتی، کلیوں جیسے اجلے اجلے روپ والی میشا پسند تو امی کو بھی بہت آئی، مگر وہ چاہتی تھی کہ ساجد تعلیم مکمل کر کے ملازمت شروع کر دے تب اس کی شادی کی جائے ابھی بڑے بھائی کی بھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ کتنے جتنوں سے امی کو منایا کہ تعلیم بھی مکمل ہو جائے گی۔ ملازمت بھی مل جائے گی لیکن تب تک میشا جیسی حسین لڑکی کو کوئی اور لے اڑے گا۔ بات امی کی سمجھ میں آ گئی اور پھر تو انہوں نے میشا کے گھر کی دہلیز لے لی اور منگنی کر کے ہی ٹلیں۔

جیسے ہی منگنی کی خبر پھیلی کتنوں کے کلیجے پر سانپ لوٹ گیا اور وہ بڑھ چڑھ کر پیشکش کرنے اور منگنی تڑوانے کی کوششیں کرنے لگے۔ تب امی کو ساجد کی بات کی صداقت کا یقین آ

گیا۔ اور کسی بھی امکانی خطرے اور بدمزگی سے بچنے کے لیے وہ جلدی سے میشا کو بیاہ لائیں اور کالج کی وہ گڑیا ان کے گھر کی زینت بن گئی۔ چاند سورج کی جوڑی تھی مگر جلد ہی سورج کو گرہن لگ گیا اور چاند بھی گہنانے لگا اور وہ سوچنے لگا کہ کاش اس نے امی کی بات مان لی ہوتی تو آج اس کی بدنصیبی میں میشا تو حصے دار نہ بنتی۔

گھر سے نکلتے ہی گھبراہٹ نے میشا کو آ لیا۔ وہ اس لیے جلدی میں تھیں کہ کہیں امی سلام پھیر کر اسے روک نہ لیں یا کوئی سبزی بیچنے والا پھیری والا ہی گلی میں آ نکلے اور اس کا لیموں خریدنے کا بہانہ ادھورا نہ رہ جائے لیکن اصل بات تو وہ ساجد کو بھی نہیں بتانا چاہتی تھی وہ اپنے محبوب شوہر کو خوب جانتی تھی آج صبح سے دوبار وہ خالہ کے خط کا پوچھ چکا تھا جو بہت ہی خلاف معمول بات تھی۔ یہ بات نہیں کہ اسے خالہ سے پیار نہیں تھا یا اس کے خط کے جواب کا اسے شوق یا انتظار نہیں ہوتا تھا لیکن آج خالہ کے خط کے انتظار کے پس پردہ اس کی بے چینی کو وہ اور امی دونوں بھانپ چکی تھیں۔ اور یہ سوچ کر میشا کا دل بری طرح دکھ گیا کہ اب ساجد کی انا کی دیوار میں بھی دراڑیں پڑنے لگی تھیں۔ پتہ نہیں وہ کتنی تکلیف میں ہے، کتنا مجبور ہے کیا محسوس کر رہا ہے۔ ایک تو یہ مشکل ہے کہ اس گھر میں سب جھوٹ کے لبادے اوڑھے پھرتے تھے۔ ایک دوسرے کو دکھ نہ پہنچانے کی خاطر اپنے اپنے جذبات چھپا کر جھوٹ موٹ ہنستے بولتے اور خود کو نارمل ظاہر کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں اور تو اور ساجد اسے بھی اپنے صحیح جذبات نہیں بتاتا۔ نہیں بتاتا کہ اپنی طرف بڑھتی ہوئی موت کے انتظار کی گھڑیاں گنتے ہوئے اس پر کیا کیا قیامت بیتتی ہیں۔ جذبوں اور امنگوں بھری اس عمر میں بھری جوانی میں دنیا چھوڑنے اپنی میشا کو چھوڑنے کا خیال اس کے دل پر کیسی چھریاں چلاتا ہے۔ دونوں جھوٹ موٹ حسب معمول ہنستے مسکراتے یہ دوہرا کردار ادا کرتے وقت اسے کرب کی کن کن منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ کچھ بھی تو نہیں بتاتا بلکہ وہ تو کسی تارک الدنیا راہب کی سی بے نیازی اور بلندی سے بولتا ہے۔

"دیکھو میشا، موت کا ایک دن مقرر ہے تو جو چیز ازل سے مقدر میں لکھی گئی اس پر کیا زور، سو تسلیم و رضا ہی فرض عبودیت ہے۔ اگر مجھے یہ بیماری نہ بھی ہوتی تو جب میرا وقت آتا تو

میں کسی ایکسیڈنٹ میں مرجاتا اس لیے اس پر سوچنا اور غم کھانا چھوڑ دو۔"

اور پھر اسے اپنے بازوؤں کے گھیرے میں لے کر گنگنانے لگتا۔

مت کھوجو جس کو پا نہ سکو جو پل مل جائے غنیمت ہے

ہنس ہنس کے ہمیں سمجھاتے ہیں یہ گل مستانے رنگ رنگ کے

اور وہ ساری گھٹن دل میں دبائے اس کی خاطر مسکرانے لگتی وہ اسے کہنا چاہتی تھی کہ آخری لمحے تک بے خبر ہنستے کھیلتے اچانک مرجانا اور لمحے لمحے کی سولی پر لٹکنا برابر کیسے ہوسکتا ہے اور کیا اسے اس دکھ کا اندازہ ہے جو اس کو کھو دینے کی صورت میں اسے اٹھانا ہوگا وہ یہ سب کیسے سہہ پائے گی اس کے بنا وہ زندگی کا پہاڑ اکیلے کیسے کاٹے گی۔ وہ جیسے اس کا ذہن پڑھ لیتا۔

"میں سوچتا ہوں بیٹا! اگر ہمیں ہر لمحے ایک دوسرے سے بچھڑ جانے کا اتنا خوف نہ ہوتا تو شاید عام شادی شدہ جوڑوں کی طرح ہمارے پیار میں بھی ٹھہراؤ اور بدرنگ یکسانیت آجاتی۔ اب یہی دیکھو بچھڑنے کے خوف نے ہمارے پیار میں کتنی شدت پیدا کردی ہے اور ہر لمحے کے ساتھ اس میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ اتنا پیار تو کوئی سو سال کی زندگی میں ایک دوسرے کو نہ دے سکتا ہوگا۔ وہ سلطان ٹیپو نے کہا تھا نا کہ "پیار کی ایک دن کی زندگی بنا پیار کے سو سال کی زندگی سے بہتر ہے۔

اور اس کی اس تحریف پر وہ اور ساجد دونوں ہنستے ہنستے بے حال ہوجاتے اور وہ سوچتی کہ کاش ان کی مالی حیثیت اتنی ہوتی کہ وہ بون میرو ٹرانسپلانٹ کرا سکتے۔ سنا ہے ستر بہتر فیصد مریض صحت یاب ہوجاتے ہیں اور میرا ساجد تو نوجوان ہے ابھی بیماری سے لڑنے کی توانائی اس میں ہے وہ ضرور صحت یاب ہوجاتا یا پھر اس سے تو بہتر تھا کہ یہ امکان موجود ہی نہ ہوتا کم از کم یہ حسرت تو نہ گھلاتی رہتی کہ کاش وہ کچھ کر پاتے۔ وہ اسے خیالوں میں کھویا دیکھ کر کہتا۔

"دیکھو بیٹا جانی! وہ سب جو ہمارے امکان میں نہیں ہے وہ سب جو ہمارا مقدر ہوچکا ہے اس پر سوچنا بیکار ہے۔ ہمارے پاس جو بھی وقت ہے اسے ہم صرف ایک دوسرے کی قربت اور محبت کو محسوس کرتے ہوئے گزاریں گے۔"

ایسا کرنا آسان نہ تھا لیکن پھر بظاہر یوں ہو گیا جیسے کوئی خلاف معمول بات ہے ہی نہیں۔ گھر میں ہی اس موضوع پر کوئی بات نہ ہوتی اور باہر تو خیر کسی کو کانوں کان خبر ہی نہ تھی لیکن موت کے بڑھتے ہوئے قدموں کی چاپ وہ سب سن رہے تھے جو اندر ہی اندر سب کو دہلائے دے رہی تھی۔ کبھی کبھی یہ تناؤ اتنا بڑھ جاتا کہ میشا کو لگتا کہ وہ سارے ایک دھماکے سے پھٹ جائیں گے۔ ساجد چیک اپ کرا کر آتا تو میشا کی خاموش نظریں سوال کرتیں۔

''پہلے سے بہتر ہے، انجکشن کام کر رہے ہیں۔'' اور وہ جا کر چادر اوڑھ کر لیٹ جاتا۔

میشا وہی خاموش سوالی نگاہیں لیے سسر کے پاس جا کھڑی ہوتی جو ساجد کو چیک اپ کے لیے لے جاتے تھے۔

''بہتر ہو رہا ہے بیٹی! اس مالک کے آگے کیا ناممکن ہے۔ وہ مردوں کو جلا دے سکتا ہے تو وہ ساجد کو صحت کیسے نہیں دے سکتا، وہ معجزے دکھا سکتا ہے۔ دعا کرتی رہا کرو بیٹی، دعاؤں میں بڑا اثر ہوتا ہے۔''

اور میشا فوراً ہی وضو کرنے چل دیتی۔

یہ ساجد کی قوت ارادی تھی، ایمان کی پختگی یا میشا کی محبت کا اعجاز کہ صرف انجکشنوں سے ہی حالت کسی حد تک کنٹرول میں تھی، زیادہ تیزی سے نہیں گر رہی تھی لیکن برا یہ ہوا کہ شاہد محمود کی نوکری ختم ہونے سے مالی حالات بگڑ گئے۔ علاج معالجے کے لالے پڑ گئے۔ ہوتے ہوتے پہلے ساس کے زیورات بکے پھر بہو کے۔ پھر آہستہ آہستہ گھر کی قیمتی چیزیں کم ہوتی گئیں اور اب تو صرف سر چھپانے کا ٹھکانہ ہی باقی بچا تھا جسے اگر اونے پونے بیچ بھی دیتے تو کتنا عرصہ علاج چلتا۔ مہینے کے علاج کا خرچہ پچیس تیس ہزار سے کچھ زیادہ ہی تھا اور مکان کوئی کروڑوں کا تو تھا نہیں۔ ایک اوسط درجے کے علاقے میں، اوسط درجے کا معقول سا گھر تھا۔ زیادہ سے زیادہ سال دو سال کے علاج کے پیسے نکل آتے۔ مگر پھر ہر مہینے کرائے کے پیسے کہاں سے آتے۔ ادھر ادھر سے ادھار لے کر کچھ ماہ تو نکل گئے مگر شاہد محمود کی بیروزگاری کا بھید کھلتے ہی مزید ادھار ملنے کی کوئی توقع نہ رہی لیکن جب انجکشنوں کے ناغے ہونے لگے اور ساجد کی حالت گرنے لگی تو باپ سے برداشت نہ ہوا اور انہوں نے عقل کے سب مشوروں کو

پس پشت ڈال کر مکان کو سیل پر لگا دیا۔ مگر یہ کوئی سونا تو تھا نہیں کہ ہاتھوں ہاتھ بک جاتا، پتہ نہیں کب گاہک ملتا۔

اب اس گھر کی چھوٹی سی دنیا بے شمار قیامتوں سے دو چار تھی تبھی امی کی سگی بہن عنقا جو مدتوں سے امریکہ میں مقیم تھی، بہن کو ملنے پاکستان آئی۔ نادرہ اور عنقا کی پانچ چھ سال کی چھوٹائی بڑائی تھی۔ مزاجاً تو عنقا، نادرہ کی طرح نرم خو اور خوش طبع تھی لیکن بڑی شوخ و شنگ اور من موجی تھی۔ پڑھنے لکھنے کی بے انتہا شوقین، اپنی الگ ہی دنیا کی باسی۔ نادرہ کی شادی کے دو سال بعد سکالرشپ پر امریکہ پڑھنے گئی تھی۔ سال بھر بعد اماں ابا سے ملنے گرمیوں کی چھٹیوں میں آئی ہوئی تھی، تبھی وہ اچانک حادثہ ان کے والدین کو ان سے چھین کر لے گیا۔ کمرے کی چھت گرنے سے اماں ابا ایک ساتھ سدھار گئے۔ دونوں بہنیں صدمے سے بے حال تھیں۔ نادرہ رو دھو کر اپنے گھر لوٹ آئی اور عنقا اپنی تعلیم مکمل کرنے واپس امریکہ لوٹ گئی۔ تب سے جو گئی تو آج کل کرتے کرتے سالوں پر سال بیتتے چلے گئے اور وہ وہیں بس کر رہ گئی۔ دو تین سالوں میں چکر لگا لیتی۔ ایک بہن کا ہی تو دم تھا۔

لوگ اس کے متعلق قیاس آرائیاں کر کر کے افواہیں پھیلاتے رہتے۔ کوئی کہتا کسی امریکی سے شادی کر رکھی ہے۔ کوئی کہتا شادی تو کی تھی مگر طلاق ہو گئی ہے۔ کوئی کہتا دودھ پینے کو ملتا ہے تو بھینس پالنے کی کیا ضرورت ہے۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں...... مگر جب وہ آتی تو اپنی پرانی ترنگ میں حال حلیے سے بے نیاز، وہی بے ساختہ گفتگو، وہی محبت بھرا لہجہ، سراپا عجز و انکسار، ایک ایک سے خود جا کر ملنا حتی الوسع چپکے چپکے ہر ایک کی مدد کرنا...... تو سب کے منہ پر تالے پڑ جاتے اور وہ اس کے لیے سراپا تپاک و محبت بن جاتے۔ نادرہ ان کی منافقت پر کڑھتی۔ وہ بہن کو کہتی:

''منافق ہیں سب، کمینے ہیں، میں بتاؤں یہ کیا کیا بکتے ہیں تمہارے پیچھے۔''

''آپی پلیز! مجھے نہ بتائیں، آخر انسان ہی تو ہوں کہیں کوئی بات میرے بھی دل میں اٹک گئی تو خواہ مخواہ دل برا ہو جائے گا دوسروں سے۔ اور اس چھوٹی سی زندگی میں میرے پاس کرنے کو بہت کام ہیں۔ یقین میرے پاس نفرت کرنے کو ذرا سا بھی وقت نہیں ہے۔ کہنے دیں

جو کہتے ہیں مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔''

نادرہ عنقا کو سمجھانے لگتی۔ ''شادی کر لے اچھی بہنا!''

''مذاق نہ کریں آپی! اتنی بڑی ہو کر بچوں جیسی باتیں کرتی ہیں۔'' وہ ہنس دیتی۔

''مذاق کی کیا بات ہے، ابھی بھی مل جائے گا کوئی نہ کوئی۔'' نادرہ سنجیدہ ہو جاتی۔

''کوئی نہ کوئی......!'' وہ ہنس ہنس کے لوٹ پوٹ ہو جاتی۔

''آپی! مجھے بالکل فرصت نہیں ہے، ورنہ تمہاری بات مان لیتی اور ''کوئی نہ کوئی'' سے شادی کر لیتی۔

میری بھولی آپی! دنیا میں کرنے کو بہت سے کام ہیں اور ہر کوئی اپنے اپنے دائرے میں گھوم رہا ہے اس لیے کچھ ایسے لوگوں کو بہت ضرورت ہے جو دائروں میں قید نہ ہوں اور جہاں ان کی ضرورت ہو وہاں پہنچ سکیں۔ ایک میرے شادی نہ کرنے سے کوئی قیامت نہیں آ جائے گی۔''

اور وہ اسی طرح مسکراہٹیں بکھیرتی، محبتیں لٹاتی واپس لوٹ جاتی۔

اس بار آئی تو بہن کے دکھوں کو جان کر بہت پریشان ہوئی، بہت روئی، بھانجے کو پیار کیا، دلاسہ دیا، اسے امریکہ آ کر ٹرانسپلانٹ کرانے کی پیشکش کی اور بتایا کہ ستر بہتر فیصد مریض مکمل صحت یاب ہو جاتے ہیں۔ مگر ساجد نے انکار کر دیا۔

''نہیں خالہ، اگر ماں باپ کی اتنی حیثیت ہوتی تو اور بات تھی۔ میں اتنے بڑے احسان کا بوجھ لے کر زندہ نہیں رہ سکوں گا اور ہو سکتا ہے میں ان ستر فیصد خوش نصیبوں کی بجائے تیس فیصد بدنصیبوں میں سے ہوں۔ تو میرے مقدر میں جتنی زندگی ہے وہ میں والدین اور عیشا کے ساتھ گزار کر مرنا زیادہ پسند کروں گا۔ بجائے اس کے کہ ان کے لیے ترستا ہوا مروں۔ مجھے زندگی اتنا لالچ نہیں۔''

''مجھے تو ہے۔'' عیشا نے ملتجی نظروں سے ساجد کو دیکھا۔

''نہیں عیشا!'' ساجد نے سختی سے کہا۔

اور عنقا کی نظروں میں گزشتہ کئی سالوں کے کیس گھوم گئے جو تقریباً سبھی ناکام ہوئے

تھے اور وہ بھی خاموش ہوگئی۔ مگر بہنوئی کی بیروزگاری کے پیش نظر اس نے بہن کو باقاعدگی سے تیس ہزار مہینہ بھیجنے کی پیشکش کی۔ ساجد کو معلوم ہوا تو اس نے احتجاج کیا۔

''دیکھو بیٹا! تیرے ابا بیروزگار ہیں، بہن میری مدد کر رہی ہے، یہ ہمارا بہنوں کا معاملہ ہے۔ تم کیوں ذہن پر بوجھ لیتے ہو۔ تمہارا کیا خیال ہے، میں خوشی سے ایسا کر رہی ہوں؟ کسی سے لینا آسان ہے کیا؟'' ساجد کی امی رونے لگیں اور وہ خاموش ہوگیا۔

جوں جوں دن گزرتے جا رہے تھے، ادھر انجکشنوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی ادھر ان کی قیمت بڑھتی جا رہی تھی۔ بہرحال خالہ کے روپوں سے کافی آسرا تھا مگر اس مہینے ادھر سے مکمل خاموشی تھی۔ امی نے خط بھی لکھا، مگر کوئی جواب نہ آیا۔ یہاں تک کہ آج پہلی بار ساجد بھی پوچھ بیٹھا تو میشا نے اپنی آخری چھوٹی سی انگوٹھی جو اس نے نشانی کے طور پر سنبھال کر رکھی ہوئی تھی، نکالی۔ یہ انگوٹھی اسے ساجد نے منگنی کے بعد عید پر دیتے ہوئے کہا تھا۔

''میشا! میں طالب علم ہوں اور ابھی میری اتنی ہی حیثیت ہے لیکن اس کے ساتھ جو جذبات ہیں وہ دنیا بھر کے ہیرے جواہرات سے زیادہ قیمتی ہیں۔''

''جانتی ہوں، تمہارے بتانے کی ضرورت نہیں۔ میں اس کی قیمت سے آگاہ ہوں۔'' میشا نے جواب دیا تھا۔

وہ جیولر کی دکان پر گئی اور انگوٹھی ہاتھ سے اتار کر کاؤنٹر پر رکھ دی۔ ''مجھے یہ انگوٹھی بیچنا ہے۔''

کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھے ہوئے نوجوان نے پہلے انگوٹھی اور پھر میشا کو دیکھا۔ اسے میشا کے تمتماتے ہوئے گلابی چہرے اور صاف ستھرے لباس میں غربت کی کوئی جھلک نظر نہ آئی۔

''کیوں بیچنا چاہتی ہیں، اس کا کیا ملے گا آپ کو؟''

''جو بھی ملے قیمت بتایئے اس کی۔'' میشا نے قدرے خفگی سے کہا۔

نوجوان دوکاندار میشا کے طنطنے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولا۔

''ویسے تو اس کی قیمت سات آٹھ سو روپے سے زیادہ نہیں، ہاں خوبصورت ہاتھوں کی زینت بن کر انمول بھی ہو سکتی ہے۔''

''شٹ اپ!'' میشا غصے سے بولی اور انگوٹھی اٹھا کر چل دی۔

اور نوجوان لڑکا جو بڑے بھائی کی دکان پر کچھ دیر کو آ بیٹھا تھا کہ بھائی کو کوئی ضروری کام آ پڑا تھا، گنگنانے لگا۔

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب............

اور میشا ذلت کے احساس سے سلگ اٹھی۔ اس کا دل چاہا وہ واپس لوٹ جائے مگر پھر ساجد کی شکل آنکھوں کے سامنے آ گئی اور وہ اگلی دکان پر چلی گئی اس کے گھر سے قریب مارکیٹ میں سونے کی دو ہی تو دکانیں تھیں۔ یہاں بھی دکاندار نے قیمت آٹھ سو روپے لگائی۔ اس نے قیمت بڑھانے پر اصرار کیا تو دکاندار نے خریدنے میں عدم دلچسپی کا اظہار کیا۔ میشا فوراً مان گئی۔ آٹھ سو روپے لے کر وہ پبلک انٹرنیشنل فون بوتھ پر گئی، گھر کا فون تو عدم ادائیگی کی وجہ سے کٹ چکا تھا۔ خالہ کا فون ملایا۔ خوش قسمتی سے خالہ مل گئیں۔ بڑی محبت سے خیر و عافیت پوچھی۔ خط کا جواب نہ دینے کی معذرت کی اور بتایا کہ وہ اس مہینے پیسے نہیں بھیج سکیں گی کیونکہ کچھ اچانک اخراجات آ گئے۔ اگلے مہینے ضرور کچھ نہ کچھ بھجوانے کی کوشش کریں گی......اور اسی میں تین منٹ پورے ہو گئے۔ میشا کی سبز جھیلوں سے ٹپاٹپ موتی اس کی خالی انگلی پر گرنے لگے۔

میشا کا فون بند ہوتے ہی عنقا اپنے نئے دوست کا نمبر ملانے لگی۔ اس ٹرپ میں حسب معمول اپنی بھاگتی دوڑتی مصروفیات میں اس کی اتفاقیہ طور پر ہی اس شخص سے ملاقات ہو گئی تھی۔ غیر رسمی سی اس ملاقات میں نہ بڑے بڑے حوالوں سے بات ہوئی نہ وقیع علمی نکتے زیر بحث آئے اور نہ ہی ایک دوسرے پر اپنی علمیت کا رعب گانٹھا گیا۔ ہلکی پھلکی سی سادہ گفتگو تھی۔ معلوم نہیں وہ وقت کا کوئی ایسا لمحہ تھا جب کیفیتوں کا ورود ہوتا ہے یا پھر وہ کئی دنوں کی کم خوابی اور تھکن سے نڈھال تھی۔ اس کے دفاعی نظام نے ہتھیار ڈال دیئے تھے اور وہ بیداری و نیم خوابی کی درمیانی کیفیت میں تھی یا پھر واقعی وہ آواز ہی ایسی تھی کہ سیدھی دل کے دروازے پر جا دستک دیتی ہے۔ جو بھی تھا وہ سحر زدہ سی بیٹھی تھی اور وہ ٹھہرا ٹھہرا مدھم مگر گہرا گہرا شیریں لہجہ اسے کسی ایسے سرسبز اور دور دراز جزیرے پر لے گیا جہاں لہروں کا مدھم مدھم شور تھا۔ اس کا وجود

کسی پرندے کے پر کی طرح ہلکا پھلکا ہو گیا تھا اور سکون کا ایک بے پایاں احساس ٹھنڈک بن کر اس کے ذہن میں اترتا جا رہا تھا اور یوں غیر شعوری طور پر ہی وہ اپنی زندگی کے اس نئے اور انوکھے تجربے سے لطف اندوز ہونے لگی۔

دو چار بار ٹرائی کے بعد نمبر مل گیا۔

''ابھی پاکستان سے کال آئی تھی، میں سمجھی تھی تم ہو۔ مگر تمہیں اتنی توفیق کہاں، تمہاری آواز سننے کے لیے تو مجھے ہی فون کرنا ہوتا ہے۔ معلوم ہے اس مہینے میرا فون بل کتنا آیا ہے ...... نو سو ڈالر...... بہت مہنگی ہے تمہاری آواز......!'' اور وہ ہنسنے لگی۔

پھر باتوں کا سلسلہ دراز ہوتا گیا اور منٹ گھنٹا گھٹ ڈالروں میں بدلتے گئے۔

سوشل ورک

آج ٹی وی پر طوفان برف و باد کی پیشین گوئی سن کر میری طبیعت ایک دم مکدر ہو گئی۔ موسم بھی کیسے اندھے ہوتے ہیں۔ ہمیشہ ہی بے وقت آتے ہیں۔ یہ طوفان ایک ہفتہ پہلے یا ایک ہفتہ بعد نہیں آ سکتا تھا۔ میں نے جھنجھلا کر سوچا۔

سیڑھیاں اترتی ہوئی ریما کی اور میری نظریں آپس میں ٹکرائیں اور وہ دوبارہ اوپر چڑھ گئی۔ میں نے سنا وہ حسنی سے چپکے سے کہہ رہی تھی۔ ''آج تو مطلع صبح صبح ابر آلود ہے، طوفان کے آثار دکھائی دے رہے ہیں۔''

''نیچے اترو، طوفان کی بچی......'' مجھے مزید غصہ آ گیا۔

''امی! ماشاء اللہ آپ کی سماعت بہت تیز ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے بات کو ٹالنے کی کوشش کی۔ مگر میری پیشانی کی شکنوں کو مزید گہرا ہوتے دیکھ کر سنجیدہ ہو گئی۔

''تمہیں اپنے علاوہ کسی کا ہوش ہے؟ اس ہفتے شدید برفباری کی پیشین گوئی ہے۔''

''کب سے؟'' ریما نے سوال کیا۔

اور میں تقریباً چلا اٹھی۔ ''آج سے۔''

''تو آپ اتنی پریشان کیوں ہیں؟ دسمبر کے مہینے میں یہ تو معمول کی بات ہے اور پھر ہم لوگوں کی کل سے چھٹیاں ہیں، آپ کو یہ فکر بھی نہیں ہو گی۔ کھانے پینے کی خریداری آج کر

لیتے ہیں۔''

''اپنے علاوہ کچھ سوجھتا بھی ہے تمہیں! کچھ معلوم ہے دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ صومالیہ میں کتنے لوگ اور کتنی بے بسی سے مر رہے ہیں۔''

ریما کی آنکھیں پہلے حیرت سے پھیلیں اور پھر وہ مسکراہٹ کو دبانے کی کوشش کرنے لگی۔ غالباً اسے راچسٹر کی برفباری اور صومالیہ کے قحط میں کوئی تعلق دکھائی نہیں دے رہا تھا یا یہ کہ یہاں کی برفباری سے صومالیہ کے قحط زدگان کو کوئی نقصان پہنچ سکتا تھا۔ اس کی دبی دبی مسکراہٹ نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔

''ہاں، پاگل ہو گئی ہوں میں۔'' میرا غصہ انتہا کی حدوں کو چھونے لگا تھا۔ ''تم لوگ تو چاندی کا چمچ منہ میں لے کر پیدا ہوئے ہو۔ جو چاہا مل گیا۔ تمہیں تو ایک وقت کی بھوک کا بھی تجربہ نہیں ہے۔ تمہیں کیا معلوم کہ بھوک کیا ہوتی ہے۔ موت اور وہ بھی بھوک سے...... کتنی دردناک ہوتی ہے۔''

حسنی بھی نیچے آ چکا تھا اور دونوں شرمندہ شرمندہ سے کھڑے تھے۔ جب میں کافی دیر بول چکی تو میرا غصہ قدرے مدھم ہو گیا۔

ایک دم ہی میں حسنی کی طرف پلٹی۔ ''مجھے پرسوں چرچ جانا ہے، لے جاؤ گے؟''

''چرچ......؟'' ریما نے ایک بار پھر آنکھیں پھیلائیں۔

''ہاں، چرچ'' میں نے اسے گھورا۔

''ہاں جی، لے جاؤں گا۔'' حسنی جلدی سے بولا۔ وہ ماحول میں مزید کشیدگی پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''مگر موسم کا کیا ہو گا؟'' میں نے تشویش بھرے انداز میں کہا۔

''کوئی بات نہیں، آہستہ آہستہ چلے جائیں گے۔ چرچ تو بہت قریب ہے۔''

''نہیں، مجھے یہاں نہیں بفلو کے ڈاؤن ٹاؤن والے چرچ میں جانا ہے۔''

حسنی کے چہرے پر سوال ہی سوال تھے لیکن اس نے زبان سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں کی۔ میں نے خود ہی وضاحت کی۔ ''دراصل بفلو کے چرچ میں صومالیہ کے ریفیو جی آ کر

ٹھہرے ہوئے ہیں، ہم ان کے لیے گرم کپڑے اور کوٹ وغیرہ لے کر جائیں گے۔"

"اوہ......اب بھی۔" ریما نے لمبی سانس لی۔" آپ اگلے ہفتے چلی جائیں۔"

"اگلے ہفتے چلی جاؤں؟......اور موسم دیکھا ہے، کتنی سردی ہوگئی ہے۔ انہیں گرم کپڑوں کی ضرورت ہے۔ اس موسم میں تمہارے پاس گرم کپڑے نہ ہوں تو پتہ چلے۔" میں پھر طعن وطنز پر اتر آئی۔

منطق اور دلائل کے جدید دور کی پروردہ میری بیٹی ہتھیار بہت کم ڈالتی ہے تا آنکہ میں ماں ہونے کا حق استعمال کرتے ہوئے اسے خاموش ہو جانے کو کہہ دوں یا وہ برا مان کر چلی جائے۔ اس کے اور میرے درمیان اکثر محاذ آرائی رہتی ہے اور ہم دونوں ہی کبھی ایک دوسرے کو قائل نہیں کر سکے۔ کبھی ہم اکتا کر خاموش ہو جاتے ہیں، کبھی برا مان کر اور کبھی بحث کو کسی خوب صورت موڑ پر چھوڑ دیتے ہیں۔

میرا موڈ نارمل ہوتے دیکھ کر اس نے حسب معمول جرح کی۔" چرچ میں ہیٹنگ کا بہت اچھا انتظام ہے۔ اندر تو انہیں گرم کپڑوں کی ضرورت نہیں اور اس ہفتے باہر جانے کا موسم نہیں۔ ویسے بفلو میں بہت لوگ ہیں، تہمینہ آنٹی......"

میں نے چڑ کر بات کاٹی۔" کر تو سب کچھ تہمینہ آنٹی رہی ہیں۔ گرم کپڑے بھی اس نے جمع کر رکھے ہیں۔ دے بھی آئے گی مگر کیا میرا کوئی فرض نہیں بنتا۔ تم لوگوں کے ناز اٹھانے کے علاوہ بھی دنیا میں کام ہوتے ہیں۔" آج میری گفتگو میں دلائل سے زیادہ طعن وطنز تھا۔ کیونکہ موسم کی پیشین گوئی نے میرا موڈ خراب کر دیا تھا۔ اور میں چڑچڑی ہو رہی تھی۔

ریما بےلطف ہو کر کمرے میں لوٹ گئی۔ اب سامعین میں سے صرف حسنی بچ گیا تھا جو میرے مزاج اور حالات کو سنبھالنا خوب جانتا تھا۔ میں تھوڑی دیر تک قہر آلود نظروں سے ریما کے کمرے کے بند دروازے کو گھورتی رہی اور پھر حسنی سے مخاطب ہوئی، جس نے بڑی عاجزی اور فرمانبرداری سے "جی" کہہ کر میرے غصے کے شعلوں پر پانی ڈال دیا۔

"اصل بات یہ ہے بیٹا کہ کرسمس پر چرچ میں کام کرنے والے لوگ چھٹی کر رہے ہیں تو دو دن ہم کچھ خواتین رضا کارانہ طور پر کام کریں گے اور کھانا وانا پکائیں گے۔ اپنے لیے تو

انسان ساری عمر ہی کرتا ہے، کچھ انسانیت کی بھی خدمت کرنی چاہیے۔ یہ ہم پر انسانیت کا قرض ہے جو ہمیں ادا کرنا چاہیے۔ بہت سکون ملتا ہے۔ اسی کے لیے مجھے بفلو چرچ جانا ہے۔ گرم کپڑے بھی ساتھ لے جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے امی!'' اور وہ چلا گیا۔

بات اتنی آسان نہیں تھی جتنی میرا بیٹا سمجھا تھا۔ سب خواتین جا رہی تھیں اور سینکڑوں لوگ دیکھنے والے تھے تو اب روزمرہ کے سادہ اور پہلے سے پہنے ہوئے لباس میں تو نہیں جا سکتی تھی۔ چلو لباس میں کوئی سا پہلے کے کپڑوں میں سے منتخب کر لوں مگر کوٹ جوتے اور پرس تو ڈھنگ کا ہونا ضروری ہے۔ جوتوں کی بات بھی سنو، شوز کے طفیل رہ جائے گی مگر کوٹ، سکارف اور پرس کا اچھا ہونا تو انتہائی ضروری ہے۔ اور پھر کھانا پکانے کے لیے وہ ایپرن تو کوئی نہیں پہنے گا جو روزانہ وہاں کے ملازمین پہنتے ہیں۔ یقیناً کھانا پکانے والی رضا کار خواتین اپنے اپنے ایپرن لائیں گی۔ میرے پاس تو سڑا ہوا ایپرن ہے، سالوں پرانا ہے۔ ثمینہ کا ایپرن کیسا خوبصورت تھا، کل میں نے دیکھا تھا کچن میں اس کے ہاں..... اپنی نفاست دکھانے کا یہی تو موقع ہے۔ نیا ایپرن بھی خریدنا ہوگا۔ ثمینہ سے بھی اچھا خریدوں گی اور پھر دستانے وغیرہ بھی۔

یہ سب تو ہو جاتا، موسم نے بہت بری طرح رنگ میں بھنگ ڈالا ہے۔ یہ معمول کی برفباری نہیں تھی بلکہ شدید برفباری کا طوفان تھا۔ مگر ان میں سے کوئی بات ٹالی نہیں جا سکتی اور میں رضا کارانہ طور پر کام کرنے کا وعدہ کر چکی تھی۔ سوسائٹی میں ناک تو نہیں کٹائی جا سکتی۔

خریداری دنیا کا سب سے مشکل کام ہے۔ دو دن شدید ترین موسم میں ہم ماں بیٹا خوار ہوتے رہے، تب کہیں جا کر خریداری مکمل ہوئی۔ کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا پڑتا ہے۔ اور کسی کو سکھ دینے کے لیے کچھ دکھ تو اٹھانا ہی پڑتا ہے۔ بیچارے غربت و فلاکت زدہ اپنے مظلوم بہن بھائیوں کے لیے اتنی تکلیف اٹھانا تو کوئی بات ہی نہیں تھی۔ شاپنگ مالز پر چکراتے ہوئے یہی سوچ دل کو سکون دیتی۔

اور پھر آج چرچ جانے کا دن بھی آ گیا۔ موسم نے بھی ضد باندھ رکھی تھی۔ ہم بیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گاڑی چلاتے دعائیں اور آیت الکرسی پڑھتے کوئی تین گھنٹے میں بفلو

پہنچے۔ سوال تین گھنٹے کا نہیں تھا، ہر لمحے گاڑی کے پھسل جانے اور ایکسیڈنٹ کا تھا۔ راستے میں بے حساب ایکسیڈنٹ ہوئے ہوئے تھے، ان کو دیکھ کر مزید ڈر لگ رہا تھا۔ لیکن دل کو ایک تسلی تھی کہ نیکی کے راستے میں جتنی تکلیف اٹھاؤ، اتنا ہی ثواب ملتا ہے۔

چرچ پہنچ کر ساری کوفت ساری تھکن دور ہو گئی۔ میری محنت ضائع نہیں گئی تھی۔ میرا کوٹ اور پرس سب سے خوبصورت تھا۔ ہم سب والہانہ جذبے سے کام میں جٹ گئے۔ سب نے کھانے کے آئٹم بانٹ لیے۔ سو لوگوں کے لیے کھانا بنانا تھا۔ میں نے چکن روسٹ کا ذمہ لیا۔ سبھی نے دل لگا کر کھانا بنایا اور بہت اچھا بنایا۔ اچھا ہوا میں نے ایپرن خرید لیا۔ سب کے ایپرن بہت خوبصورت تھے۔ ہو سکتا ہے انہوں نے بھی میری طرح ہی نئے خریدے ہوں۔ مجھے ہنسی آ گئی۔

کھانا تیار کرنے کے بعد جب لوگ ڈائننگ ہال میں جمع ہوئے تو ٹی وی پر دیکھے ہوئے ہڈیوں کے ڈھانچے متوقع صومالین نہیں تھے بلکہ تقریباً نارمل لوگ تھے۔ ہمیں بتایا گیا کہ جب یہ آئے تھے تو کافی بری حالت میں تھے لیکن گزشتہ پانچ ماہ میں اچھی خوراک، علاج سے یہ لوگ ٹھیک ہو گئے ہیں۔ ہم نے چکن روسٹ، پلاؤ، سلاد، ڈنر رول، سویٹ ڈش وغیرہ انہیں سرو کی۔ ایسا کرتے ہوئے ہمیں بہت خوشی اور سکون محسوس ہو رہا تھا۔

کھانے کے بعد ہم نے گرم کپڑے میزوں پر رکھ دیے تا کہ سب اپنی ضرورت اور سائز کے مطابق لے لیں۔ انہوں نے بڑی بے اعتنائی دکھائی۔ ہمارے اصرار پر کچھ چیزیں لے لیں اور باقی میزوں پر چھوڑ کر ڈائننگ ایریا سے نکل گئے۔ غالباً رضا کار اور چیزیں زیادہ تھیں۔ ہم صومالیہ میں بھوک سے دم توڑتے ہوئے لوگوں کے حصے کا کھانا بھی انہی کو کھلانے پر مصر تھے اور وہاں کے بے لباس لوگوں کے بدلے کا لباس بھی انہی کو پہنانا چاہتے تھے۔

ہم اپنی ڈیوٹی کامیابی سے نبھا کر لوٹ آئے۔ اگلے ہفتے ثمینہ کے ہاں لنچ پر صومالیہ کا ذکر آ گیا۔ سو لوگوں کا کھانا بنانا کوئی مذاق نہیں، ہم نے بڑی عمدگی سے لنچ اور ڈنر سرو کیا، میری آنکھیں فخر و غرور سے چمک اٹھیں۔ میں نے تحقیر سے آس پاس نگاہ ڈالی۔ ہم سے تو جتنا بھی جو ہو سکا ہے، کیا ہے۔ اور مجھے لگا کہ میں نے صومالیہ کے قحط میں اپنا حصہ ادا کر دیا ہے، اب مجھ پر

کوئی قرض نہیں۔ پانچ سو ڈالر خرچ ہو گئے تھے اس سلسلے میں...... بے شک چار سو کے کوٹ اور جوتے وغیرہ میرے تھے۔ مگر وہ بھی لیے تو اسی سلسلے میں تھے اور اللہ تو نیت کا بدلہ دیتا ہے اور پھر سو ڈالر کے سیکنڈ ہینڈ کوٹ اور جیکٹ تو انہی کے لیے خریدے تھے۔

چھوٹا آدمی

''آہستہ بولیں وہ سن لے گا۔'' نگینہ بولی۔

''دیکھا بھائی صاحب آپ نے، بھابی کے اسی رویے کی وجہ سے تو ہم نے کبھی کچھ کہنے کی کی ہمت نہیں کی۔'' شفیق خان براہ راست بڑے بھائی سے مخاطب ہوا۔

''اور ہم اس کی وجہ بھی خوب جانتے ہیں۔'' منجھلا خلیق خان بولا۔

''کیا جانتے ہو تم، کیا وجہ ہے...... کچھ مجھے بھی تو پتہ چلے۔'' رفیق خان نے بیوی پر ایک قہر بھری نظر ڈالتے ہوئے بھائی سے پوچھا۔

''یہی کہ حسین گل اچھا ملازم ہے، بھابی کو اس کی وجہ سے بہت آرام ہے۔ ان کو اپنی سہولت سے مطلب ہے ہماری عزت، بے عزتی کی انہیں کیا پرواہ ہے، وہ ہمیں ناراض کر سکتی ہیں حسین گل کو نہیں۔'' خلیق خان نے دونوں کی ترجمانی کی۔

دونوں باتیں اپنی جگہ درست تھیں۔ حسین گل محنتی اور اچھا ملازم تھا اور اس کی بیوی نگینہ آرام طلب اور کام چور تھی لیکن اس کے لیے وہ گھر آئے مہمانوں اور خصوصاً اس کے بھائیوں کی عزت کا خیال نہ کرے، یہ ناقابل برداشت تھا۔ رفیق خان کو غصہ آنے لگا۔

''ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' نگینہ نے اپنی صفائی پیش کرنی چاہی۔

''ایسی کوئی بات نہیں تو پھر چپ رہو اور اس معاملے میں دخل اندازی نہ کرو۔'' رفیق

خان نے بیوی کو ڈانٹا۔

دیوروں کے سامنے اپنی توہین پر وہ کٹ کر رہ گئی۔

"ٹھیک ہے آپ کی مرضی مگر.........."

"کیا مگر......؟" رفیق خان نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔

"کچھ نہیں، جو چاہیں کریں آپ کی مرضی۔" وہ بھی برا مان گئی اور اٹھ کر جانے لگی۔

"بھابی! آپ فکر نہ کریں، میں آپ کو اس سے اچھا ملازم لا دوں گا اور کل ہی......" خلیق نے گویا تلافی کی کوشش کی۔

"یہ بات نہیں، میں تو کچھ اور کہنے والی تھی۔" اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور وہ وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔

"بھائی صاحب! میں آپ کی جگہ ہوتا تو حسین گل کو ابھی اسی وقت فارغ کر دیتا۔" شفیق بولا۔

"اور میں آپ کی جگہ ہوتا تو بہت پہلے نکال چکا ہوتا۔" خلیق نے بڑھاوا دیا۔

"میں بھی اسے نکالتا ہوں ابھی اسی وقت، تمہارے سامنے۔" رفیق خان نے فیصلہ صادر کر دیا۔

"اوقات سے بڑھ کر عزت و اہمیت مل گئی تھی اسے، یہ چھوٹے آدمی.........." شفیق نے جملہ ادھورا چھوڑ کر باقی کام چہرے کے تاثرات سے لیا۔

اور پھر حسین گل کو بلا کر بوریا بستر سمیٹنے کے لیے کہہ دیا گیا۔

"میں تو تمہیں پولیس کے حوالے کرنا چاہتا تھا مگر تمہاری باجی نے مجھے روک دیا ہے۔"

"صاحب! میں قسم کھاتا ہوں......" حسین گل نے اپنی صفائی پیش کرنی چاہی۔

"بس، اب کسی قسم اور کسی بات کی گنجائش نہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ میرے دو سو ریال تم نے ہی چرائے ہیں۔ رات میرے بٹوے میں پانچ ہزار تھے اب دو سو کم ہیں۔" شفیق خان نے پورے وثوق سے کہا۔

"صاحب، میں صرف دو سو ریال.........." حسین گل نے پھر وضاحت کی کوشش کی۔

"بات دو سو ریال کی نہیں، چاہے دو لاکھ ہوں یا صرف دو، بات اصول کی ہے۔" خلیق

خان نے اضافہ کیا۔

"صاحب............!" حسین گل نے اپنے صاحب کو کچھ کہنا چاہا۔

مگر صاحب اپنی خوابگاہ میں جا چکے تھے۔

"ہو سکتا ہے شفیق نے پیسے کہیں خرچ کر دیئے ہوں اور اسے یاد نہ رہے ہوں۔" نگینہ نے پھر بات چھیڑی۔ "کیا اس نے سونے سے پہلے گنے تھے؟"

"ہاں، اسے پکا یقین ہے، اب چھوڑو بھی اس ذکر کو۔"

"فرض کرو............"

"اب کچھ بھی فرض کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ فیصلہ ہو چکا ہے۔ حسین گل جا رہا ہے۔" رفیق خان نے مضبوط لہجے میں کہا اور کروٹ بدل لی۔

فوراً ہی انہیں نیند آ گئی اور ان کے ہلکے ہلکے خراٹے خواب گاہ کی فضا میں مدھم سا ارتعاش پیدا کرنے لگے۔ نگینہ جاگ رہی تھی اور بھاری دل سے سوچ رہی تھی کہ وہ تو ہمیشہ سے ہفتوں اور بعض اوقات مہینوں کے لیے پورا گھر اس پر چھوڑ جاتی تھی۔ اسے تو کبھی ایسی شکایت نہیں ہوئی اور اگر شفیق کو اتنا ہی یقین ہے اور حسین گل نے واقعی پیسے چرائے ہیں تو کیا پندرہ سال کی بے لوث خدمت گزاری کے بدلے اسے ایک بار معاف نہیں کیا جا سکتا تھا۔

حسین گل اس گھر میں پندرہ سال سے ملازم تھا۔ گھر اور گھر والوں کے ساتھ اس کی وفاداری کسی شک و شبے سے بالاتر تھی۔ نگینہ نے اس سے کبھی سخت لہجے یا اونچی آواز تک میں بات نہیں کی تھی۔ بچے بھی عزت سے پیش آتے۔ رفیق خان اگرچہ تند خو شخص تھے، لیکن حسین گل کی چستی اور عمدہ کارکردگی کی وجہ سے کم ہی شکایت کا موقع ملتا۔ بڑا گھر تھا۔ مہمانداری کثرت سے ہوتی خاص طور پر چھوٹے بھائیوں اور ان کے بال بچوں کا آنا جانا لگا ہی رہتا۔ نگینہ نہ بھی ہوتی تو بھی وہ آتے جاتے رہتے۔ حسین گل کو اس گھر کا مفاد عزیز تھا تو وہ بعض اوقات بچوں کو توڑ پھوڑ اور گندگی پھیلانے پر ٹوک دیتا جو رشتہ داروں کو کھلتا۔ وہ نگینہ سے شکایت کرتے وہ سنتی تو بڑے رسان سے مگر حسین گل کے خلاف نہ کوئی کارروائی کرتی نہ اسے ڈانٹتی ڈپٹتی، جس کا مطلب لیا جاتا کہ اسے صرف اپنا آرام عزیز ہے۔ خاندان کی عزت کا کوئی خیال نہیں کہ انہیں نوکروں سے ذلیل کراتی ہے۔

وہ رفیق خان کو تو شاید منا ہی لیتی مگر اب بھائیوں کے سامنے فیصلہ ہو چکا تھا اور وقار کا مسئلہ بن گیا تھا اور دوسری صبح دس بجے ہی ڈرائیور ٹکٹ، پاسپورٹ اور اس کے بقایا جات لے کر پہنچ گیا۔ حسین گل حیران تھا کہ سارے کام اتنے جلدی کیسے ہو گئے۔ مگر پیسے کا اسم اعظم سارے بند دروازے کھول دیتا ہے۔

رخصت ہوتے وقت حسین گل بولا۔ "باجی! مجھ سے جو بھی غلطیاں ہوتی رہیں، معاف کر دینا۔ میں نے تو سوچا تھا اب زندگی آپ لوگوں کے قدموں میں ہی کٹے گی، مجھے کیا پتہ تھا........." اور اس کا گلہ رندھ گیا۔

"تمہیں معلوم ہے حسین گل، صاحب بھائیوں کے سامنے مجبور ہو گئے تھے ورنہ ہم نے بھی کب سوچا تھا۔" اور نگینہ کی بھی آنکھیں بھر آئیں۔

"باجی! صاحب سے تو مل ہی نہیں سکا۔ میرا سلام بول دینا اور انہیں بھی کہنا کہ میری غلطیاں معاف کر دیں۔"

اور نگینہ نے صرف سر ہلا دیا بولنے کی اس میں سکت ہی کہاں تھی۔

یہ سب کچھ اتنی تیزی سے واقع ہوا تھا کہ حسین گل کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا اس کے تو جیسے حواس سلب ہو گئے تھے۔ وہ جہاز میں سوار ہو گیا اور جب جہاز نے زمین کو چھوڑا تو اس کے دماغ کو ایک دم جھٹکا سا لگا......تو وہ سچ مچ جا رہا ہے اس سرزمین کو چھوڑ کر، کبھی نہ لوٹنے کے لیے، یہ سب آناً فاناً کیسے ہو گیا اور اس کے ذہن میں اس کی گزشتہ پوری زندگی کسی فلم کی ریل کی طرح چلنے لگی۔

دس سال کی عمر میں وہ اپنے دور دراز پہاڑی گاؤں سے اپنی روزی کمانے کراچی آ گیا تھا۔ یہ بندوبست کیسے ہوا وہ نہیں جانتا۔ اس کے باپ نے اسے اس آدمی کے حوالے کیا تھا جو اسے صاحب کے گھر پہنچا گیا تھا۔ اس کے صاحب ایک بڑے کاروباری آدمی تھے۔ سختی سستی سہتے، محنت مشقت کرتے وہ ان کے بچوں کے ساتھ پل کر جوان ہو گیا۔ وفاداری اور خلوص اس کے طبعی جوہر تھے اور محنت گھٹی میں پڑی تھی۔ اپنا بن کر رہا۔ حتی الوسع تمیز تہذیب بھی سیکھ لی۔ دو چار مہینے میں گاؤں کا چکر بھی لگا آتا۔ وہ بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ تین اور بھائی بھی اس طرح نو نو دس دس سال کی عمروں میں مختلف شہروں، مختلف گھروں میں کام کرنے

لگے تھے۔ دو چھوٹی بہنیں اور ماں باپ گاؤں میں تھے۔

وقت پر لگا کر اڑتا گیا۔ اس کی شادی ہو گئی۔ ہوتے ہوتے چار بچے بھی ہو گئے۔ چاروں بیٹے تھے۔ اس کے بیوی بچے گاؤں میں ماں باپ کے ساتھ رہتے۔ دو اور بھائیوں کی بھی شادیاں ہو گئیں۔ زندگی جیسے تیسے کٹ رہی تھی۔ پھر پہلے بیگم صاحب گزر گئیں، اس کے چند مہینوں بعد بڑے صاحب گزر گئے۔ چھوٹے صاحب نے سب بیچ باچ کر امریکہ جانے کی ٹھانی لیکن جاتے جاتے وہ یہ بھلا کر گئے کہ اپنے ایک دوست سے جن کا تقریباً پورا خاندان سعودی عرب میں مقیم تھا سفارش کر گئے اور اپنی ذاتی گارنٹی دی کہ آدمی گھر میں رکھنے کے لائق ہے۔ اس طرح وہ سعودی عرب آ گیا اور ان کی گھر داری کا حصہ بن گیا۔

یہاں ماحول پہلے بہت بہتر تھا کہ بیگم سادہ طبیعت کی عورت تھیں ان میں بیگمات والی خو بو نہیں تھی۔ ان کے مزاج کی وجہ سے بچے بھی عزت سے پیش آتے تھے۔ صاحب اگر چہ غصے کے تیز تھے، مگر فیاض طبع تھے یہاں آنے سے اس کے گھر میں بھی کچھ خوشحالی آ گئی تھی۔ اس کے بچے سکول جانے لگے تھے۔ بھائیوں کی شادیاں ہو گئی تھیں۔ ایک بہن کی بھی شادی ہو گئی تھی۔ صرف ایک بہن کی شادی کرنا باقی تھی۔ وہ تو سوچ رہا تھا کہ بہن کی شادی کے بعد کچھ جمع جوڑ کر گھر وغیرہ بنانے کی کوشش کرے گا کہ ماں کو دل کی بیماری ہو گئی۔ ڈاکٹروں نے آپریشن کا مشورہ دیا۔ صاحب نے کہا تھا کہ وہ فکر نہ کرے وہ مدد کر دیں گے اور تب یہ واقعہ ہو گیا۔ صاحب کے بھائی ان کے گھر مہمان آئے اور چھوٹے بھائی نے صاف اس کا نام لے کر کہہ دیا کہ اس نے ان کے بٹوے میں سے دو سو ریال چرائے ہیں۔ آنکھوں سے کسی نے بھی نہیں دیکھا تھا پھر بھی نتیجے کے طور پر وہ آج واپس جا رہا تھا۔ صاحب نے اس کے بوڑھے ماں باپ، جوان بہن اور چار بچوں کی روزی پر کھڑے کھڑے لات مارتے ہوئے یہ بھی نہ سوچا کہ اگر وہ پیسے نہ بھیجے گا تو ان کے پاس تو اگلے دن کی روٹی بھی نہیں ہو گی۔ باقی بہن بھائی غریب اپنا گزارہ ہی بمشکل چلا رہے تھے۔ کھانے پینے اور دوسرے اخراجات سے اگر چار پیسے بچتے بھی تو وہ ماں باپ کی بیماری پر اٹھ جاتے۔ صاحب کو یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ تو اس کی ماں کے دل کے آپریشن میں اس کی مدد کرنے والے تھے۔

اس کی نظروں کے سامنے اس گھر میں گزارے ہوئے پندرہ سال گھوم گئے۔ اگر چہ

باجی نرم مزاج زیادہ تھیں مگر اسے اپنے صاحب کا بہت خیال رہتا اس لیے نہیں کہ وہ کچی طبیعت کے تھے اور انہوں نے ہر موقعے پر کھلے دل سے اس کی مدد کی تھی، اس لیے کہ وہ بہت محنت کرتے تھے اور کسی سیر تفریح کے لیے ان کے پاس کبھی وقت ہی نہ ہوتا۔ باجی تو وقتاً فوقتاً کبھی اپنی دوستوں، کبھی بچوں اور کبھی رشتہ داروں کے ساتھ گھومنے پھرنے نکل جاتیں اور پھر ہفتوں اور بعض اوقات مہینوں بعد لوٹتیں۔ وہی پورے گھر کا انتظام سنبھالتا۔ صاحب کے کھانے پینے، جوتے، کپڑے، آرام کا خیال رکھتا۔ وہ ایک ایک کے مزاج سے واقف تھا، سب کی ان کی طبیعت کے مطابق خدمت بجالاتا۔ کبھی کبھی تو اسے یوں محسوس ہوتا کہ وہ ان لوگوں کو اپنے گھر والوں سے زیادہ چاہتا ہے۔ پندرہ سال زندگی کا ایک حصہ ہوتا ہے جس کا زیادہ تر وقت اس نے ان لوگوں کے ساتھ گزارا تھا۔ باجی یوں تو خوش خلق اور حلیم طبع تھیں، مگر اپنی ہی طبیعت کی مالک تھیں۔ انہوں نے گھر میں کبھی دلچسپی نہ لی تھی۔ بہت ہوا تو کبھی پھول پودے یا سجاوٹ کا کوئی سامان لے آئیں۔ بڑی حد کی تو سامان کی ترتیب بدلوالی۔ ان کی موجودگی میں بھی سارا انتظام وہی چلاتا۔ صاحب کے کاموں کی دیکھ ریکھ بھی وہی کرتا۔ پیسے والے ہیں، ملازم تو بے شک مل جائے گا مگر بیچاری باجی کو کتنی پریشانی ہوگی۔ نیا آدمی کیسے سب طور طریقے سمجھے گا، اس میں تو وقت لگے گا۔ اسے باجی پر ترس آنے لگا۔

اسے پھر صاحب یاد آئے۔ بیچارے بھائیوں کے سامنے، گھر کی عزت کے ہاتھوں مجبور ہو گئے ہوں گے ورنہ تو انہیں معلوم ہے میں انہیں کتنا چاہتا ہوں اور ساتھ ہی ایک خیال کے آتے ہی اسے لگا جیسے کسی نے اس کا دل مٹھی میں بھینچ دیا ہو۔

''باجی تو بہت لاپرواہ ہیں، اب صاحب کا خیال کون رکھے گا۔''

اور وہ کندھے پر پڑے ہوئے سرخ چارخانہ رومال کا پلو چہرے پر ڈال کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔